ماہنامہ

حکمۃ قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے
اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

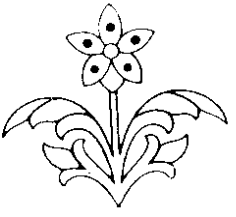

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲ - ایمپرس روڈ - لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۴ | جولائی ۱۹۸۵ء بمطابق شوال المکرم ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۵

سالانہ زرِ تعاون -/۳۰ روپے —— فی شمارہ -/۳ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون ۸۵۳۶۱۱

مضمون نگار حضرات کے آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

فہرس

★ حرفِ اوّل ——— ۳
عاکف سعید

★ حکم و عبر ——— ۵
قاری سعید الرحمٰن علوی

★ الٓمٓ (سورۂ مریم) ——— ۱۷
ڈاکٹر اسرار احمد

★ قرآن خدا کی کتاب ——— ۲۲
مولانا وحید الدین خان

★ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کا مقصدِ حیات ——— ۵۴
سید نفیس الحسینی

★ ہدایت القرآن ——— ۶۱
مولانا محمد تقی امینی

قرآن اکیڈمی میں قرآن کی بہار ——— ۶۸
شیخ رحیم الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عاکف سعید

حرفِ اوّل

ماہ رمضان المبارک رخصت ہوا۔ وہ مہینہ جس کی مدح کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "یَا اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّکُمْ شَھْرٌ عَظِیْمٌ، شَھْرٌ مُبَارَکٌ شَھْرٌ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ" یہ الفاظ مبارک حضورؐ کے اس عظیم خطبے کے ہیں جو آپ نے ۲۹ شعبان کو ارشاد فرمایا تھا[1]۔ پھر اس خطبے کے اختتامی الفاظ بھی ماہِ رمضان کی عظمت کو مزید اُجاگر کرتے ہیں کہ وَھُوَ شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَ اَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ۔ قابلِ تہنیت 'مبارک باد' ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس مہینے کی برکات سے حصہ وافر پایا اور خیر و برکت کے اس فصلِ بہار سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت سے اپنے دامن کو بھر لیا اور اپنے لیے عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ کا سامان کر لیا۔ اور افسوس ہے ان پر اور پھر افسوس ہے ان پر کہ جنہوں نے یہ مبارک مہینہ پایا لیکن وہ اپنی غفلت کے پردوں کو چاک نہ کر سکے اور گویا وہ اس مصرعے کی عملی تصویر بن گئے کہ ؎

"اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے"

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں رمضان المبارک کے دوران جو دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام تشکیل دیا گیا۔ وہ دراصل اس ماہِ مبارک کی برکات سے اپنی امکانی حد تک استفادے کی کوشش کا ایک مظہر تھا۔ الحمدللہ کہ یہ پروگرام بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس دورہ ترجمہ قرآن کی ایک مختصر رپورٹ اسی شمارے میں قارئین کی نظر سے گزرے گی

مولانا محمد تقی امینی کی ذات قارئینِ حکمتِ قرآن کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے موصوف مسلم یونیورسٹی

---

[1] یاد رہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک خطبے کا پورا متن ہم نے حکمتِ قرآن کی مئی کی اشاعت میں اندرونی ٹائٹل پر شائع کیا تھا۔

علی گڑھ شعبۂ سنی دینیات کے ناظم ہیں۔ حکمتِ قرآن کے آغازِ اجراء ہی سے ہمیں مولانا کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ مولانا کے پُر از شفقت تعاون کا یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا اور مولانا کی سرپرستی مستقلاً ہمیں حاصل رہے گی (ان شاء اللہ) حال ہی میں مولانا کا حد درجہ دقیق مضمون 'قرآنی علم و فہم کا درجۂ حکمت' جو قسط وار حکمتِ قرآن میں شائع ہو رہا تھا، اختتام پذیر ہوا ہے۔ اس موقعہ پر مولانا کی شفقت و عنایت کا یہ مظہر سامنے آیا کہ مولانا نے 'ہدایت القرآن' کے عنوان سے ایک اور نہایت عالمانہ مضمون ہمیں ارسال فرما دیا جو ان شاء اللہ العزیز قسط وار شائع کیا جائے گا۔ اسی سلسلے کی پہلی قسط اسی اشاعت میں شامل کی جا رہی ہے۔ اپنے اس مضمون کے ساتھ مولانا نے حکمتِ قرآن کے اعزازی مدیر کے نام جو مکتوب ارسال فرمایا ہے وہ ہمارے لیے نہایت حوصلہ افزا ہے۔ لیجئے! آپ حضرات بھی ملاحظہ فرمائیے!

علی گڑھ، ۴ مئی

مخدومی سلام مسنون، دعائیں،

'ہدایت القرآن' روانہ ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو قسط وار میثاق یا حکمتِ قرآن میں شائع فرما دیں۔ چاہیں تو نام بدل کر سورۃ فاتحہ کی تفسیر کر دیں۔ یہ آپ کی مرضی کی بات ہے۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں۔ دعاء کی درخواست ہے۔ حضرت مولانا کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔

ماشاء اللہ حکمتِ قرآن کا معیار آپ نے کافی بلند کر لیا ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ اب نوجوانوں ہی سے توقع ہے کہ وہ کچھ کر سکیں گے اور خوشی کی بات ہے کہ وہاں نوجوانوں کی ٹیم بیدار مغزی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ حکمتِ قرآن کے مضامین دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ والسلام!

محمد تقی امینی، علی گڑھ

*

حکم وعیر

مولانا سعید الرحمٰن علوی

اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں خواتین کی علمی و ملّی خدمات

حضور نبی کرم خاتم النبیین والمعصومین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔

جس قسم کے حالات سے بنی اسرائیل کو دوچار ہونا پڑا اسی قسم کے حالات میری امت پر آئیں گے اور اس میں اس حد تک مماثلت ہوگی کہ نبی علیہ السلام نے "حذ والنعل بالنعل" کی مثال ارشاد فرمائی اور آگے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کسی بدکردار نے شامت اعمال کے سبب علانیہ اپنی والدہ کے ساتھ منہ کالا کیا تو میری امت میں بھی ایسے روسیاہ ہوں گے جو اس قسم کی حرکت کریں گے۔ (مشکوٰۃ صـ۲۲)

اسی حدیث میں بنی اسرائیل کے ۷۲ فرقوں میں بٹ جانے کا ذکر ہے اور امت محمدیہ کے ۷۳ فرقوں میں بٹ جانے کی پیشین گوئی۔ اور یہ ارشاد کہ یہ سب فرقے اور طبقات جہنمی ہوں گے ایک فرقہ ہوگا جو اس مقام عذاب سے محفوظ رہے گا۔ وہ ایک فرقہ اور طبقہ جسکو نجات کی خوشخبری ملی۔ اس کی علامت و نشانی پوچھی گئی تو فرمایا۔ ماانا علیہ واصحابی

گویا حقیقۃً تو حضور نبی کرم علیہ السلام کی اتباع کرنے والے ہوں اور تبعاً صحابہ کرام کی کہ انہوں نے متابعت نبوی اور اسوۂ رسول کو اپنانے میں کمال درجہ کا ثبوت دیا اور ہر موقعہ پر اس مشعل ہدایت کو سامنے رکھا۔

صحابہ کرام کے معیار حق ہونے کی بحث کے ضمن میں دور اول و آخر کے علماء نے جن دلائل کا ذکر کیا انہیں یہ حدیث بڑی اہم ہے جس کے راوی شیخ الصحابہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں اور اسکو روایت کیا امام ترمذی قدس سرہ نے۔ جبکہ اس روایت کو برائے نام لفظی اختلاف کے ساتھ امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مسند میں اور امام ابوداؤد قدس سرہ نے اپنی سنن میں خلیفہ عادل و راشد حضرت معاویہ رضؓ

سے نقل کیا۔ اور جو حضرات صحابہ کرام کے معیار حق ہونے کو نہیں مانتے انہیں اہل بدعت وضلال میں شمار کیا۔

خیر یہ تو برسبیل تذکرہ بات آگئی اصل جو بات کہنا تھی وہ یہ ہے کہ جوں جوں دنیا دور نبوی سے دور ہو رہی ہے اور قیامت کا زمانہ قریب آرہا ہے توں توں مختلف النوع فتنے جو دینی اور فکری نوعیت کے ہیں، ہمارے اندر سر اٹھا رہے ہیں۔ اس وقت جن نہایت درجہ سنگین مسائل سے ہمیں دو چار ہونا پڑ رہا ہے انمیں سے ایک مسئلہ خواتین کے حقوق کا ہے۔ ایک تو المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں فرائض کی کوئی بات کرتا ہی نہیں، سب حقوق کی بات کرتے ہیں۔ اور ماشاء اللہ کچھ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، جنہیں فرائض کی فکر واحساس ہے لیکن انہیں طرح طرح سے نشانہ ستم بنایا جاتا ہے۔

اور پھر حقوق کے معاملہ میں ستم یہ ہے کہ قرآن وسنت اور آثار صحابہ سے جو صورت سامنے آتی ہے اسکا لحاظ کیے بغیر اپنی ہی سوچ کو بنیاد بنایا جاتا ہے یا پھر بین الاقوامی طور پر تہذیب وتمدن کی اجارہ دار قوموں کے افکار وروایات کی نقالی کی جاتی ہے۔ حالانکہ سیدھا سادا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ ہدایت کے حقیقی سرچشمہ قرآن کی طرف رجوع ہو اسکی بنیادی شرح وترجمانی حضور علیہ السلام نے کی اس پر نگاہیں مرکوز کی جائیں لیکن ایسا نہیں بلکہ اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینے کی فکر کی جاتی ہے۔ جو ہماری ہر نوع کی بیماریوں کا باعث ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عورت نسل انسانی کا اہم ترین حصہ ہے۔ نسل انسانی کی بقا میں جہاں مرد کا رول ہے وہاں عورت کا بھی کم رول نہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ رب العزت نے قرآن عزیز کی آیت ۱۸۷ سورۃ البقرۃ میں عورت ومرد کو ایک دوسرے کے لیے بمنزلہ لباس قرار دیا۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔

اور اسی سورۃ کی آیت ۲۲۸ میں حقوق کی بحث کے ضمن میں واضح طور پر فرمایا کہ انمیں سے ہر ایک کے لیے دوسرے کے ذمہ حقوق ہیں۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔

لیکن ساتھ ہی سورہ نساء کی آیت ۳۲ میں ارشاد فرمایا

اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو آپس میں ایک دوسرے پر فوقیت اور برتری عطا کی ہے، ان چیزوں کی ہوس اور تمنا نہ کیا کرو۔

مردوں کا ان کی استعداد کے موافق حصہ ہے اور عورتوں کا ان کی استعداد کے موافق حصہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اسکا فضل مانگا کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے (ترجمہ مولانا احمد سعیدؒ)

اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت وخوبصورتی کے ساتھ مرد وعورت کے الگ الگ دائرہ کار اور ان کی استعداد واستحقاق کا ذکر فرما دیا اور اپنی اپنی حدود سے تجاوز کرنے سے روکا کر اس طرح کے اقدام سے

نظر کے راستے وا ہوتے ہیں۔ لیکن جس چیز سے ہمارے مالک نے روکا، ہم اسی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور اس کے لیے عنوان ایسا گمراہ کن اختیار کیا کہ توبہ بھلی! کہ صاحب عورت تو مظلوم و بے بس ہے لہذا اس کی مظلومیت و بے کسی کے ازالہ کے لیے اس کو آزادی ملنی بڑی ضروری ہے۔

ایسی گمراہ کن گفتگو کرنے والے غالباً نہیں سوچتے کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام جب مبعوث ہوئے تھے تو پوری دنیا میں عورت عجیب بے کسی و بے بسی کی زندگی گذار رہی تھی حتیٰ کہ بُرا نہ منایا جائے تو کہا جائے گا کہ وہ منڈی کی جنس تھی اس کی خرید و فروخت، اس کے حقوق کی پامالی اور اس کے عزو شرف اور تکریم و وقار کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

نبی علیہ السلام کے اولین مخاطب حجاز کے لوگ تھے، انہیں سے بھی بلد امین کے باسی، یعنی اس شہر کے افراد جس میں اللہ تعالیٰ کا گھر واقع تھا لیکن وہ اعتقادی، معاشرتی اور اخلاقی طور پر ہر بُرائی کا شکار تھے ان کی درندگی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیتے۔ قرآن عزیز نے ان کی حماقتوں اور سفلہ پن کا ذکر کیا (ترجمہ ملاحظہ فرمائیں)

> اور جب انہیں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ مارے رنج کے کالا پڑ جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے۔ اور اس چیز کی ننگ و عار سے جس کی اس کو خبر دی گئی تھی قوم سے چھپتا پھرے کہ آیا اس لڑکی کو ذلت گوارا کر کے رہنے دے یا اسکو مٹی میں چھپا دے آگاہ ہو وہ فیصلہ بہت ہی برا ہے۔ جو یہ کر رہے ہیں۔
>
> (النحل: ۵۸-۵۹)

اس دور کی دو بڑی سلطنتوں میں سے ایک ایران کی سلطنت تھی جسکا معاشرتی چہرہ اس طرح مکروہ ہے کہ ذکر کرنا مشکل ہے وہاں کے لوگ ہوس رانی اور جنسی طور پر جس فحش کاری کا شکار رہتے اس کا اندازہ اس سے کرنا آسان ہوگا کہ وہاں کسی قسم کی عزیزداری کے تقدس کا لحاظ کیے بغیر ہر شخص ہر عورت سے غیر قانونی نہیں قانونی طور پر بھی ہو جاتا۔ اس سرزمین ایران سے جذباتی رشتہ رکھنے والے طبقات بالخصوص شیعہ اسکول میں متعہ کی جو گرم بازاری ہے کیا عجب کہ وہ اسی قدیم معاشرتی رسم کی صدائے بازگشت ہو۔ سے

منظور ہے کہ سیم تنوں کا وصال ہو   مذہب وہ چاہیئے کہ زنا بھی حلال ہو۔

ادھر ہندوستان میں حال یہ تھا کہ اگر خاوند مر گیا تو ظالم معاشرہ اس کی بیوہ کو بھی ساتھ ہی جلا ڈالتا اور بیوہ کے نکاح کا جہاں تک تعلق ہے تو اس معاملہ میں اکثر و بیشتر ممالک کا رویہ یکساں تھا لیکن قرآن عزیز نے اس رسم بد پر جہاں لوگوں کو سختی سے ٹوکا اور نکاح ثانی سے روکنا عورت کی آزادی پہ حملہ بتلایا وہاں

نبی کریم علیہ السلام نے کئی ایک نکاح بیوہ عورتوں سے کیے حتیٰ کہ پہلا نکاح ۲۵ سال کی بھرپور جوانی کی عمر میں ایک بیوہ سے ہی کیا یعنی سیدتنا خدیجہ طاہرہ سلام اللہ تعالیٰ علیہا و رضوانہ جنہیں قبول اسلام کا سب سے پہلے شرف ہی حاصل نہ ہوا بلکہ انہوں نے اپنی بے بہا دولت سرکار دو عالم کے قدموں میں ڈھیر کر کے اور پہلی ہی وحی سے آپ کی غمگساری کا حق ادا کر کے اپنے شرف و مجد کا ثبوت دیا۔

اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ ایک شخص پر قطعاً پابندی نہ تھی کہ وہ کتنی عورتوں سے نکاح رچائے اسلام نے مخصوص معاشرتی حالات کے تحت ۴ تک مستورات بیک وقت اپنے نکاح میں رکھنے کی اجازت تو دی لیکن قیودات اتنی بڑھا دیں کہ مسلم معاشرہ میں بمشکل ایک ہزار میں ایک فرد ایسا ملے گا جو ایک سے زائد بیویاں رکھتا ہو۔

پہلی مرتبہ نکاح ہر یا طلاق یا بیوگی کی شکل میں دوسری مرتبہ نکاح۔ اسلام نے عورت کی آزادی کا حق تسلیم کر کے اسے خود مختاری بخشی اور قرآن عزیز میں آیات وراثت نازل کر کے اس ظلم کا قلع قمع کیا جو پوری دنیا میں موجود تھا کہ عورت کا اپنے باپ۔ بھائی خاوند اور بیٹے وغیرہ کسی کے مال میں کوئی حصہ نہ تھا۔

سورۂ بقرہ کی آیات ۲۲۲ اور ۲۲۳ میں بعض ایسے ارشادات فرمائے گئے جن کے ذریعہ ایام مخصوصہ کے دوران عورتوں کے حق میں ہونے والی افراط و تفریط کا قلع قمع ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر بالغ عورت ہر ماہ کچھ دن (حتی نقطہ نظر سے کم از کم تین دن زیادہ سے زیادہ ۱۰ دن) اس صورت حال کا شکار رہتی ہے۔ لیکن کیا اس طرح وہ اچھوت بن جاتی ہے؟ نہیں اور بالکل نہیں۔

اس عرصہ میں مجوس تو اس غریب کو گھر سے نکال ہی دیتے۔ یہود گھر میں رہ کر اسے ایک جانور کیطرح الگ تھلگ رکھتے روٹی ہانڈی بستر چارپائیاں کسی چیز میں اس کا حصہ نہیں تھا نہ وہ کھا سکتی نہ پکا سکتی ایک طرف الگ تھلگ اسے خوراک برائے نام فراہم کر دی جاتی اور عیسائی تھے تو وہ ان دنوں میں کسی قسم کا پرہیز نہ کرتے حتیٰ کہ تعلقات زن شوئی کا سلسلہ جاری رہتا۔ انتہا یہ ہے کہ اہل مکہ بھی نصاریٰ کی طرح ہر طرح لذت اندوز ہوتے لیکن اسلام نے ان آیات میں توسط و اعتدال کی راہ اپنائی جس کے نتیجہ میں خاص ان ایام میں عورت کے ساتھ تعلقات مخصوصہ پر تو پابندی لگی البتہ گھر اور معاشرہ میں اسکی جو حیثیت ہے اسمیں سرمو فرق نہ آیا۔

پھر اسلام نے ایمان و اعمال صالحہ کے معاملہ میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ خیر و خوبی کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے۔ ارشاد باری کا ترجمہ ہے۔

جو نیک کام کرے گا وہ مرد ہو کہ عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو۔ تو ہم اسے زندگی

بخشیں گے ایک پاکیزہ زندگی (دنیا میں) اور ان کے ان کاموں کا جو وہ کیا کرتے ہیں
بہترین بدلہ عطا فرمائیں گے۔ (النحل: ۹۷)

سورۂ احزاب کی آیت ۳۵ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں کس طرح سے دو طبقات کو ساتھ ساتھ رکھا۔

بلاشبہ احکام اسلامی کی تعمیل کرنے والے مرد اور احکام اسلامی کو بجا لانے والی عورتیں اور ایماندار مرد اور ایمان دار عورتیں اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

یہ گفتگو اس مقصد کے لیے نہایت کافی ہے کہ اسلام کے نزدیک عورت اچھوت نہیں اسے مسلم معاشرہ میں بڑا باوقار اور شرف و مجد کا مقام حاصل ہے لیکن بعض مدعیان اسلام کا ہی معاملہ یہ ہے کہ وہ اس پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ جو کچھ اسلام نے عورت کو دیا وہ نا کافی ہے بلکہ ضرورت ہے کہ وہ صوبائی اسمبلی نیشنل اسمبلی اور سینیٹ کی ممبر ہو ہر سطح کے بلدیاتی اداروں میں ہو صوبوں اور مرکز میں اس کا وزارتی حصہ ہو مختلف النوع کھیلوں میں اس کا برابر کا حصہ ہو اور وہ شریک ٹیم ہو۔ مختلف النوع پارٹیوں اور سوسائٹیوں میں وہ مرد کے شانہ بشانہ ہو غیر مردوں سے اس کے اختلاط کا معاملہ کھلم کھلا ہو وغیر ذالک۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بے قید آزادی ہے جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ برابر ایمان کا نور ہے وہ اس قسم کی بے ہودہ بات نہیں کہہ سکتا۔ آخر یہ واقعہ ہے کہ مرحوم اقبال جو بخت و اتفاق سے ہمارے قومی شاعر ہیں انھوں نے بھی اس صورت حال سے پناہ چاہی اور نہایت ہی طنز کے انداز میں لڑکیوں کی کالج تعلیم کا ذکر کیا اور کہا ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

وہ کہتے ہیں اور کھلے بندوں کہ ہمیں فلاح نہیں بلکہ فلاح ہے تو حضرت بتول سیدتنا فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت رسول علیہ السلام کے اسوہ میں۔ اور وہ اسوہ تو بڑا واضح ہے وہاں تو شرم و حیا کی

ہے اور حجاب دستر ایسا ہے کہ ان کا جسم تو رہ گیا ایک طرف شاید ان کے لباس پر بھی غیر کی نظر نہ پڑی ہو۔

نفیس خلیلی نے اس روش پر سخت تنقید کی تھی کہ لکھا۔

مسلمان عورت ہے یا مرغ آبی — کہ سینہ کو تانے چلی جا رہی ہے
وہ مردود لہایہ جس کی دلہن ہے — وہ ملعون بھائی یہ جس کی بہن ہے

اور سید اکبر حسین مرحوم جج الہ آباد ہائی کورٹ معروف بہ اکبر الہ آبادی نے تو جو کچھ کہا وہ انتہا ہے ایک مسلمان اور قومی درد رکھنے والا انسان وہی کہنے پر مجبور ہے جو مرحوم اکبر نے کہا۔ وہ عورت کی بے حجابی کو مرد کی عقل کے دیوالیہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس روش و طرز عمل کو نہایت ہی طنزیہ انداز میں مرد و عورت دونوں ہی کی بے غیرتی و بے شرمی کا نام دیتے ہیں۔

قرآن و سنت نے بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مسلمان عورت کو معاشرتی زندگی کے معاملات میں کچھ حدود کا پابند کیا۔ اس کی ابتدا حضور نبی مکرم علیہ السلام کی ازواج مطہرات سے کی۔ بلاشبہ وہ مقدس خواتین کم از کم علامہ ابن حزم ظاہری اندلسی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول پوری امت سے افضل ہیں۔ انہوں نے اس کی تفصیلی بحث اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" میں کی۔ اور یہ تو قرآن کی حقیقت ہے کہ وہ امت کی مائیں ہیں لیکن ان امت کی ماؤں کو ارشاد ہوتا ہے۔ (محض ترجمہ ملاحظہ فرمائیں)

اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور گذشتہ دور جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔ اور تم نماز کی پابند رہو اور زکوٰۃ ادا کرتی رہو۔ اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرتی رہو۔ اے نبی کے گھر والو اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی آلودگی دور رکھے اور تم کو خوب پاک صاف رکھے (الاحزاب: ۳۳)

ظاہر ہے کہ نبی علیہ السلام کا گھر ایسا تھا کہ وہاں آنے جانے کی ہر مسلمان کو ضرورت تھی۔ مسائل معلوم کرنا کچھ لینا دینا سب اس گھر سے متعلق تھا درسیوں مواقع ایسے آسکتے تھے کہ اللہ کے نبی اپنے کاشانہ میں نہ ہوں۔ ایسی شکل میں آنے والے آئیں تو نبی کی بیویوں سے کس طرح کا برتاؤ کریں؟ قرآن عزیز نے بڑی وضاحت سے اسکی رہنمائی فرمائی اور فرمایا

اور نبی کی بیویوں سے تم کوئی سامان مانگنے جاؤ۔ تو وہ سامان پردے کے باہر سے مانگا کرو۔ یہ طریقہ تمہارے دلوں کے اور انکے دلوں کے پاک رہنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور تمکو (اے مسلمانوں) یہ بات کسی طرح جائز ہی نہیں کہ اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ۔

(الاحزاب: ۵۳)

اور اسی سورۃ کی اس مشہور آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جو آیت حجاب کہی جاتی ہے اور جسمیں چہرہ کے پردے کا ذکر ہے۔

اے نبی آپ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور دوسرے مسلمانوں کی بیویوں سے فرما دیجئے کہ وہ اپنی چادریں اوپر سے اوڑھ کر تھوڑی سی مُنہ کے آگے لٹکا لیا کریں۔ اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو وہ اذیت نہ دی جایا کریں گی (آیت ۵۹)

اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نبی علیہ السلام کے گھر سے بات شروع کی اور پھر دوسری عورتوں کو اس میں شامل کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی موقعہ پر اگر خیال پیدا ہو جائے کہ نبی علیہ السلام کی بیویاں اور صاحبزادیاں اپنی عظمت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں ان کی بیویوں کو بلاشبہ اسلامی معاشرہ کی اولین خواتین کا شرف حاصل ہے تو شاید وہ اس حوالہ سے ان معاشرتی ضوابط سے آزاد ہوں۔ نہیں بلکہ لازم و ضروری ہے کہ وہ اپنی تمامتر عظمت و مجد کے باوصف ان معاشرتی بندشوں کی پابندیوں اور خدائی قوانین کا سب سے پہلے ان پر اطلاق ہو۔

سورۂ نور جسمیں بکثرت معاشرتی اور اصلاحی مضامین ہیں اسکی آیت ۳۰ میں تو مردوں کو حکم دیا گیا کہ

وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اسمیں ان کے لیے پاکیزگی ہے۔

تو آیت ۳۱ میں عورتوں کو مخاطب کیا اور فرمایا

آپ مسلمان عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ کریں۔ مگر ہاں جو اس میں سے مجبوراً کھلا رہتا ہے اور اپنے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈال لیا کریں یعنی سینوں کو ڈھانک کر اوڑھا کریں اور اپنی زیبائش کو کسی پر ظاہر نہ کریں الخ

آگے ان اعزہ وغیرہ کا ذکر ہے جن سے شرعی حجاب نہیں یعنی خاوند، باپ، خسر، بیٹا، شوہر کا دوسری بیوی سے بیٹا، بھائی، بھائی کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنی ہم مذہب عورتیں، اپنی لونڈیاں، خواہشات سے خالی اور بے غرض خدمت گذار مرد اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا

مسلمان عورتوں سے یہ بھی فرما دیجئے کہ وہ چلنے میں اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان

تا وہ زیور پہچانا جائے جسکو وہ چھپاتی ہیں۔

سورۂ طلاق آیت نمبر ۱ اور سورۂ نساء آیت نمبر ۱۵ میں (مطلقہ) عورتوں تک کو گھر میں رکھنے (الدرکلان کا ایک حصہ مروت کے طور پر ان کے سپرد کرنے کی تلقین کی) کا ارشاد ہوا۔ الا یہ کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو پھر ان کے معاملہ میں خداوندی ضوابط کے مطابق اگلے اقدام کی اجازت ہے جس میں حدود تک کا مسئلہ آیا ہے۔

قرآنی آیات کے سرسری مطالعہ کے بعد ارشادات رسالت پر ایک نگاہ دوڑائیں اور وہ بھی اختصار کے ساتھ۔ مشہور صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام کا ارشاد نقل کیا جس میں فرمایا گیا

عورت سرتاپا پوشیدہ رہنے کے قابل ولائق ہے جونہی وہ باہر نکلتی ہے شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے۔

ام المؤمنین سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کے پاس حاضر تھیں اور ام المؤمنین سیدتنا میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی حاضر تھیں اتنے میں ایک صحابی جو نابینا تھے آئے اور حاضری چاہی۔ یہ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جنہیں آپ کے مؤذنین کی صف میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضور علیہ السلام نے ہم دونوں سے پردہ کے اندر چلے جانے کا حکم دیا میں نے ان کے نابینا ہونے کا عذر عرض کیا اور مزید کہا کہ اس صورت میں وہ ہمیں تھوڑا دیکھتے ہیں تو نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا

تم بھی نابینا ہو؟ کیا تم بھی ان کو نہیں دیکھتیں

یہ حالت ہے نبی علیہ السلام کے کاشانہ کی، کہ ان کی ازواج ہیں۔ انہیں قرآن نے امت کی مائیں کہا لیکن ان ماؤں کو اجازت نہیں کہ وہ نابینا دینی و روحانی بیٹے کی موجودگی میں وہاں رہیں یہ اور ایک ہم ہیں کہ شیطان نے ہمارے یہاں کے جاہل پیروں اور مشائخ کو یہ سبق پڑھا رکھا ہے کہ قوم کی بچیاں تمہاری بچیاں ہیں وہ بے حجاب تمہارے سامنے آسکتی ہیں اور قوم جو بدقسمتی سے جہالت کا شکار ہے اس شیطانی حربہ کا اس طرح شکار ہے کہ کسی قسم کی غیرت و شرم کا لحاظ کیے بغیر عورتیں ایسے لیڈروں کے یہاں جاتی اور ان سے ہم کلام ہوتیں اور استفادہ روحانی کرتے کرتے بسا اوقات اپنی عصمت و عفت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ اور حضور علیہ السلام نے دیور (خاوند کا بھائی) تک معاملہ میں حجاب و پردہ کی بات ارشاد فرمائی۔ جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے۔ یہ تمام روایات ہم نے حدیث کی

معروف کتاب مشکوٰۃ سے نقل کیں جبکہ شعب الایمان میں امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث نقل کی جس کے راوی حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، ارشاد ہوا

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر (جو بری نظر سے دیکھے) اور اس پر بھی جس کو دیکھے
(یعنی اگر وہ احتیاط سے کام نہ لے)

بعض دوسری روایات میں جنہیں صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا انہیں باریک کپڑے پہننے سے سختی سے روکا اور ایسی عورتوں کے متعلق فرمایا کہ وہ شیطان کی ایجنٹ ہیں جو دعوت گناہ کا باعث بنتی ہیں انہیں جنت کا داخلہ نصیب نہ ہوگا بلکہ جنت کی ہوا تک سے محروم رہیں گی۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بی بی حضور علیہ السلام کو کوئی تحریر دینا چاہتیں تو انہوں نے پردہ کے پیچھے سے وہ خط آپ کی طرف بڑھا دیا۔

ہم نے تمہیدی گذارشات میں اس طرف توجہ دلائی کہ اسلام نے عورت کے معاملہ پر کس حد تک رعایت برتی۔ اتفاق سے وہ گفتگو طویل ہوگئی پھر ستر و حجاب کی گفتگو بھی ہماری توقع سے بڑھ گئی اصل خواہش یہ تھی کہ ہم قرون اولیٰ کی ان مسلمان عورتوں (ازواج مطہرات بنات النبی اور [illegible]) کا کسی قدر تذکرہ کرتے کہ مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی میں ان کا رول کیا تھا اور کس طرح [illegible] دنیا میں انہوں نے ترقی کے مدارج طے کیے اور ایک دنیا کو مستفید کیا تاکہ ہمارے جدید عزیزوں کے ذہن سے یہ بات نکل جائی کہ اسلام اور اسلامی معاشرہ نے عورت پر ترقی کے دروازے بند کیے تاہم چند گذارشات اختصار کے ساتھ ملاحظہ فرما ہی لیں ورنہ یقین جانیں کہ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں کابر رجال کے ساتھ ان محترم خواتین کی زندگیوں کے ایمان افروز واقعات کی کمی نہیں۔

اہل سیرت و تذکرہ نے بڑی تفصیل سے ان ابواب کا ذکر کیا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان معاملات میں یہ عورتیں کس قدر بلندیوں پر فائز تھیں اور خاص اس دور کی خواتین کا تذکرہ اس لیے زیادہ اہم ہے ایک تو وہ "ما انا علیہ واصحابی" کے زمرہ میں آتی ہیں دوسرے یہ کہ ہمیں بتانا یہ ہے کہ اس دور میں جب اسلامی معاشرہ پوری برکات کے ساتھ موجود تھا تو مسلمانوں کا ذہن و قلب عورت کے معاملہ میں کس قدر وسیع تھا اگر اس دور میں علم و شرافت کی راہیں ان پر وا تھیں تو بعد کے کسی دور میں پابندی کا سوال ہی نہیں عورت نے قبول اسلام کے معاملہ میں جو عظمت حاصل کی اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

میری بعثت پیر کے دن ہوئی تو خدیجہ سلام اللہ تعالیٰ علیہا و رضوانہ نے اسی دن کے

آخر حصہ میں نماز پڑھی جبکہ ابوبکر، زید بن حارثہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا معاملہ اگلے دن منقل کا ہے (ابن خمیس ص۲۸۶)

قبول اسلام کے ساتھ اس ماحول میں اعلانِ اسلام کی بات آتی ہے تو چھ مردوں کے ساتھ یہ سعادت سب سے پہلے ایک غریب مسلمان عورت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حاصل ہوئی (ابن خمیس ص۲۵۷)

اسلام کے سلسلہ میں مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی کم قربانی نہیں دی اور بے پناہ شدائد کا تحمل کیا "اسد الغابہ" میں حضرت سمیہ کے تذکرہ کو پڑھیں اور اس کتاب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تذکرہ دیکھیں تو ان کی بہن حضرت فاطمہ اور لونڈیا حضرت زنیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس راہ کی تکالیف کا اندازہ ہوگا۔

جن عورتوں کو قبولِ اسلام کی سعادت حاصل ہوئی انہوں نے کمال درجہ استقامت کے ساتھ اپنے ایمان کی حفاظت کی بخاری کے باب ذکر صلح حدیبیہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ارشاد ہے۔

ہم کسی ایسی مہاجر عورت کو نہیں جانتے جو ایمان لاکر پھر مرتد ہوئی ایسا ہوا ہی نہیں۔

طبقات ابن سعد میں حضرت ام شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ذکر ہے کہ قبولِ اسلام پر ان کے اعزہ نے دھوپ میں ڈال کر گرم کھانے کھلائے لیکن وہ پابند اسلام رہیں اور جب حضرت زنیرہ تکالیف کے سبب اندھی ہوگئیں اور لوگوں نے کہا کہ لات وعزیٰ نے ایسا کیا تو فرمایا یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے (اسد الغابہ تذکرہ زنیرہ) ایمان ویقین کی اس کیفیت کے سبب یہ خواتین عبادات میں اپنی مثال آپ تھیں حضرت عمر کی اہلیہ کا عشاء اور فجر کی جماعتوں میں برابر شریک ہونا بخاری سے ثابت ہے اس طرح عام مسلمان عورتوں کا جمعہ کے اجتماع میں شریک ہونا اور اسکا اہتمام کرنا بخاری میں موجود ہے نماز اشراق اور تہجد کے سلسلہ میں عورتوں کا التزام موطا باب صلاۃ اللیل میں موجود ہے اور مزید تذکرہ بخاری کتاب الاطعمہ باب الحشف میں ہے۔

زکوٰۃ وصدقات میں ترغیب پر عورتوں کا اپنے زیورات اتار کر نبی علیہ السلام کے قدموں پر ڈال دینا ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ کے ساتھ مسند احمد جلد ۱ ص۱۹۵ مطبوعہ لبنان میں ہے۔

نفلی روزوں کے اہتمام کا حال مسند احمد ج۶ ص۲۵۵ ابوداؤد کتاب الصیام میں ہے جبکہ بخاری کتاب الصیام میں بھی اس قسم کی روایات ہیں۔

حج کا شوق واشتیاق اور فرضی حج کے بعد نفلی حج وعمرہ میں عورتوں کے اشتیاق کا ذکر بخاری کتاب الحج ابوداؤد کتاب المناسک اور مسلم میں ہے۔

جہاد میں خدمات کے ساتھ شوقِ شہادت مردوں کے ساتھ جس طرح عورتوں میں تھا اس کا ذکر

ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

قرآن عزیز زندہ کتاب حیات ہے اور مسلمان قوم کی نجات اسی سے وابستہ ہے مسلمان عورتیں عمل بالقرآن کے معاملہ میں جو جذبات رکھتیں ان کا ذکر ابوداؤد کتاب الجنائز، کتاب النکاح اور کتاب اللباس میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

منہیات شرعیہ اور مشتبہات سے بچنے میں عورتوں کے شوق واشتیاق کی داستان مسند احمد ج ۶ ص ۱۵۲، ج ۶ ص ۲۴۲ ابوداؤد کتاب الوصایا طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت اسماء میں دیکھیں۔

رسول اکرم علیہ السلام مومن کی متاع ہیں ان سے تعلق ومحبت اور ان کی اتباع وتابعداری مسلمان کا اصل سرمایہ ہے اس سلسلہ میں مسلم خواتین کے جذبات کی تصویر مسلم کتاب الفضائل باب فی قرب النبی، مسند احمد ج ۶ ص ۳۴۹ ابوداؤد کتاب اللباس طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ام دینار بخاری کتاب الاستیذان مسند احمد ج ۶ ص ۴۳۰ طبقات تذکرہ حضرت ام سلیم ابوداؤد کتاب الطلاق اسد الغابہ تذکرہ حضرت شفاؐ ابوداؤد کتاب الجنائز استیعاب تذکرہ حضرت طلیب بن عمیر ابوداؤد کتاب الطب، کتاب العتاق شمائل ترمذی باب حلیہ رسول بخاری کتاب النکاح، نسائی کتاب النکاح سنن ابن ماجہ کتاب الاطعمہ ترمذی کتاب المناقب طبقات تذکرہ حضرت قیلہ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حسن خلق اور فضائل اخلاق اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے اور وہی انسان حقیقی انسان ہے جس میں یہ کمالات موجود ہوں ہماری قابل احترام خواتین اس معاملہ میں جس کردار کی حامل تھیں اسکا تذکرہ ملاحظہ فرمائیں۔

ابوداؤد کتاب الادب، بخاری کتاب المناقب، موطا کتاب الجامع، ادب المفرد باب السخاوۃ طبقات تذکرہ حضرت عبداللہ بن عبداللہ اصابہ تذکرہ حضرت زینب بنت جحش، اسد الغابہ تذکرہ معاویہ بن خدیج، نسائی کتاب النکاح مسلم کتاب الادب طبقات تذکرہ حضرت حمنہ استیعاب تذکرہ ابن زبیر اسد الغابہ تذکرہ حضرت صفیہ عمۂ رسول اللہ مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۱۸۷ اور ابن ماجہ کتاب النکاح۔

حسن معاشرت کو اللہ تعالیٰ کے رسول نے خیر وخوبی کا باعث بتایا آج بڑی بڑی قدآور شخصیات اس معاملہ میں بونی ہیں لیکن اس دور کی عورتیں کہاں کھڑی تھیں اور اس معاملہ میں ان کا کیا مقام تھا احادیث وتذکرہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں مثلاً

بخاری کتاب الادب باب الہجرۃ مسلم کتاب الفضائل فضل عائشہ، مسند دارمی کتاب الوصایا۔ ادب المفرد باب عیادۃ المریض طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت زینب، ابوداؤد کتاب الجنائز طبقات

ابن سعد تذکرہ سید الشہداء حضرت حمزہ، مسند ابو داؤد طیالسی ص موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ۔ طبقات تذکرہ حضرت ام سلیم و حضرت ام ہانی اسد الغابہ تذکرہ حضرت خولہ نسائی کتاب الزینہ ابن ماجہ کتاب الجنائز اسد الغابہ تذکرہ حضرت عاتکہ

طرزِ معاشرت میں ان خواتین نے جس سادگی، قناعت، فقر اور اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی طرح ڈالی اس کا تذکرہ تو اتنا طویل ہے کہ محض حوالے ہی طوالت کا باعث بن جاتے ہیں تاہم چند حوالے ملاحظہ فرمائیں۔

ابو داؤد کتاب اللباس۔ ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ۔ بخاری کتاب الہبۃ۔ ادب المفرد باب لا یؤذی جارہ مسلم کتاب الآداب اسد الغابہ تذکرہ حضرت قلیہ نسائی کتاب الطہارہ۔

معاملات کی دنیا ایسی ہے کہ بڑے بڑے لوگ مات کھا جاتے ہیں لیکن مسند ابن حنبل ج ص طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت مصباح اور موطا امام مالک کتاب الاقضیہ باب من لا یجوز من النحل ملاحظہ فرمائیں تو ان خواتین کے حسنِ معاملت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

خدمت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو مخدوم بناتی ہے اور جو انسان مخدومیت کے مقام پر فائز ہو وہ جب خدمت کرے تو سبحان اللہ۔ ان قابلِ احترام خواتین کی مذہبی، اخلاقی اور علمی خدمات کے مبسوط تذکرہ میں سے ہم بعض چند حوالوں پر اکتفا کریں گے۔

اسد الغابہ تذکرہ حضرت ام شریک۔ بخاری کتاب الغسل موطا کتاب النکاح ، اسد الغابہ تذکرہ حضرت زید بن سہل مسلم کتاب الطلاق اصابہ تذکرہ درہ ابو داؤد کتاب الجہاد نسائی کتاب الصلوٰۃ، سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز مسند ج سنن بیہقی ادب المفرد باب الادب اصابہ تذکرہ حضرت خولہ۔ سیرت عائشہؓ للسید سلیمان ندوی ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ عین الاصابہ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃ علی الصحابہ۔ مسند دارمی ص حجۃ اللہ البالغہ مصری ص

اختصار کے ساتھ جو حوالے دیئے گئے ان کی تفصیلات ایک دفترِ دستاویز چاہتی ہیں اس لیے اسی پر اکتفا کر کے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ رب العزت اپنے کرمِ بے پایاں سے ہماری خواتین کو صدرِ اسلام کی ان خواتین کے نقشِ قدم پر چلائے اور وہ نیک صالح اولاد کی تربیت کا باعث بنیں۔

سلسلۂ تقاریر الٓمٓ

سورۂ مریم

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم! نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کٓهٰیٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمِ۔

قرآن حکیم کی دو سورتوں کا آغاز پانچ پانچ حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ ایک سورۂ مریم اور دوسری سورۂ شوریٰ۔ سورۂ مریم مصحف میں سولہویں پارے میں واقع ہے۔ یہ سورۃ ۹۸ آیات اور ۶ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز ہوتا ہے حروف مقطعات کٓهٰیٰعٓصٓ سے۔ ان حروف کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ رائے منقول ہے کہ ان میں سے ہر حرف اللہ تعالیٰ کے کسی نام یا اس کی کسی صفت کو ظاہر کر رہا ہے۔ جیسے ک سے کریم، ھ سے ھادی، ع سے علیم، ص سے صادق۔ واللہ اعلم!

اس کی تائید میں ایک اثر بھی ملتا ہے حضرت فاطمہ بنت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ روایت کرتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی دعا میں یہ الفاظ استعمال فرمایا کرتے تھے۔

یَا کٓهٰیٰعٓصٓ اغفرلی

اے وہ ہستی جو کٓهٰیٰعٓصٓ ہے میری مغفرت فرما دے ـــــ یہ روایت سنن ابن ماجہ اور سنن دارمی میں موجود ہے مزید برآں علامہ ابن جریر طبری نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

اس سورہ کی ابتدائی ۴۰ آیات میں حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ

کا ذکر ہے، اور اس سے اصل مقصود ہے عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کی نفی۔ یعنی ان کا یہ عقیدہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں اور الوہیت میں شامل ہیں۔ اس کی پر زور نفی کے لیے یہاں جو حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش اگر معجزانہ طور پر بن باپ کے ہوئی، گویا کہ عام فطری قانون یہاں ٹوٹ گیا، تو اس سے ان کی اُلوہیت لازم نہیں آتی۔ اس لیے کہ عین ان سے متصلاً قبل حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں بھی حضرت یحییٰ کی جو پیدائش ہوئی تھی وہ بھی عام دنیاوی قاعدے اور قانون کے مطابق عام طبعی قوانین کے تحت نہیں تھی۔ اور وہ یوں کہ حضرت زکریا اور انکی اہلیہ دونوں نہایت ضعیف تھے۔ بہت بوڑھے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ حضرت زکریا کی اہلیہ حضرت یحییٰ کی والدہ تمام عمر بانجھ رہی تھیں۔ ایک بانجھ عورت کے ہاں اور وہ بھی انکے بڑھاپے کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا فرمائی۔ چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے کیا گیا تاکہ تمہید بن جائے کہ اگر خرقِ عادت ولادت ہی کسی الوہیت کی دلیل ہے تو پھر صرف مسیحؑ ہی کو نہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی الوہیت میں شامل ماننا پڑے گا۔

اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ کلام بھی نقل ہوا ہے جو انہوں نے اللہ کے حکم سے پنگوڑے میں اپنی والدہ کی برأت کے لیے کیا تھا اس لیے کہ بن باپ کے بیٹے کی پیدائش ظاہر بات ہے کہ کسقدر ایک بڑی بات تھی جو حضرت مریم سلام علیہا کے ساتھ ہوئی۔ قوم نے جب انہیں ملامت کرنی شروع کی۔ یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ اِمْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ کہ اے مریم! تم نے یہ کیا کیا؟ نہ تمہارے والد کوئی بُرے شخص تھے، نہ تمہاری والدہ کوئی آوارہ مزاج خاتون تھیں۔ اس کے جواب میں، جیسا کہ انہیں اشارہ کیا جا چکا تھا کہ تم خاموش رہنا انہوں نے عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کر دیا۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۝ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝

چنانچہ حضرت مریم سلامٌ علیہا نے اشارہ کر دیا کہ اس سے پوچھو۔ لوگوں نے کہا کہ ہم کیسے کلام کریں اس بچے سے، یہ ابھی پنگوڑے میں ہے، پالنے میں ہے چھوٹا سا معصوم بچہ ہے۔ لیکن عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہلوایا۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۔ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝

"کہا (حضرت عیسیٰ نے) میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس (اللہ) نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور

مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں کہیں میں ہوں اور اس نے مجھے تاکید کی ہے نماز اور زکوٰۃ کی جب تک میں زندہ ہوں۔" ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم۔ ان کی زندگی اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی ابتدا تا اختتام، جو بھی ہوتا ہے، کل کی کل معجزہ ہی نظر آتی ہے لیکن کوئی بھی معجزہ ہو، درحقیقت وہ قدرتِ خداوندی سے ظاہر ہوتا ہے کسی کے ہاتھ سے یا کسی کے ذریعے معجزہ ظاہر ہوتا یہ اس شخص کو خدا نہیں بنا دیتا۔ بلکہ درحقیقت معجزہ قدرت خداوندی کا ثبوت ہے اس ضمن میں اس سورۂ مبارکہ کے آخیر میں بہت زجر کا انداز ہے اور بڑی وعید آئی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کے لیے بیٹا یا بیٹی مانتے ہیں، خدا کے لیے اولاد تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس گستاخی پر اللہ تعالیٰ کا غیظ و غضب بڑی شدت کے ساتھ ظاہر ہوا ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۝

انہوں نے کہا رحمٰن نے کسی کو اپنی اولاد بنایا، تم ایک بہت بھاری بات کہہ رہے ہو۔ (بڑی گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو)۔ (یہ ایسی بھاری بات ہے اور اتنی بڑی گستاخی ہے اللہ کی جناب میں کہ) آسمان پھٹ پڑنے کو ہے زمین شق ہونے کو ہے۔ اور پہاڑ گر پڑنے کو ہیں کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے اولاد قرار دی، حالانکہ رحمان کے شایان شان ہی نہیں کہ اس کے اولاد ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد اس سورۂ مبارکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے، اور خاص طور پر ان کا معاملہ جو ان کے والد کے ساتھ پیش آیا۔ تو کیسی دلسوزی کے ساتھ انہوں نے اپنے والد کو دعوت دی۔"

يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا

"ابا جان کیوں پوجتے ہیں (کیوں پرستش کر رہے ہیں) ان چیزوں کی جو نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور آپ سے کسی تکلیف کو دور کرنے کی ان کے اندر کوئی قدرت نہیں۔"

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ

ابا جان! میرے پاس وہ علم حقیقت آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ یہی نبوت کی

اصل حقیقت ہے کہ نبی کو جو ذریعہ علم عطا ہوتا ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے ۔ چنانچہ فرمایا فَاتَّبِعْنِیْ پس آپ میرا اتباع کیجئے! میرے پیچھے چلیے، میری پیروی کیجئے۔

اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا "میں آپ کی رہنمائی کروں گا سیدھی راہ کی جانب"۔ اس قدر دلسوزی کے ساتھ دعوت دینے کے باوجود ——— باپ کا جواب یہ تھا کہ اے ابراہیم کیا تم میرے معبودوں کو چھوڑ رہے ہو؟ کیا تم ان کی تردید کر رہے ہو۔ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا دور ہو جاؤ مجھ سے، میری نگاہوں سے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت فرمائی اپنے والد کا گھر چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں جو مقام و مرتبہ عطا فرمایا، اسکا بھی یہاں تفصیل سے ذکر ہے۔ ان کے علاوہ اس سورۃ میں حضرت موسیٰؑ کا حضرت اسمٰعیلؑ کا اور حضرت ادریسؑ کا ذکر ہے۔ ایک بات جو بڑی پیاری آئی ہے جسکے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اغلباً حضرت جبرئیلؑ سے شکوہ کیا کہ آپ دیر دیر سے آتے ہیں، وقفے وقفے سے آتے ہیں، ہمیں انتظار رہتا ہے۔ آنحضورؐ کو قرآن مجید سے جو محبت تھی جو شغف تھا اس کی وجہ سے آپؐ چاہتے تھے کہ وحی جلد از جلد نازل ہو۔ لیکن حضرت جبرئیل کی زبان سے جواب دلوایا گیا:

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔

"ہم نازل نہیں ہو سکتے مگر آپ کے رب کے حکم سے"

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ۔

"ہمارے سامنے جو کچھ ہے اسکا اختیار بھی اسی کو ہے۔ ہمارے پیچھے جو کچھ ہے اس کا اختیار بھی اسی کو ہے، اور ان دونوں کے مابین جو کچھ ہے اسکا مختار مطلق بھی وہی ہے"۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝

"اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے"۔ یہ تاخیر اور یہ وقفہ جو پڑتا ہے وہ کسی نسیان کی بنیاد پر نہیں ہے۔ یہ حکمت خداوندی پر مبنی ہے ——— اختتام پر قرآن مجید کا ذکر بڑے دلنشین انداز میں آیا ہے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ۔

"اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے۔ آپ کی زبان سے"! اس سے مراد حضورؐ کی اپنی زبانِ مبارک بھی ہو سکتی ہے۔ اور عربی بھی

کہ جو آپؐ کی زبان بھی تھی۔ فرمایا ہم نے اس کو آسان بنا دیا ہے ایک تو یہ کہ آپؐ کی زبان سے ادا ہو رہا ہے اور دوسرے یہ کہ آپؐ کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اور یہ کیوں نازل ہو رہا ہے!

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝

تاکہ آپؐ اس کے ذریعہ سے اہل تقویٰ یعنی اہل ایمان کو بشارت دیں اور جو جھگڑالو لوگ ہیں، جو انکار کر رہے ہیں، نہیں مان کر دے رہے، ان کو خبردار (WARN) کر دیں اور تنبیہہ فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں بنائے اور شامل فرمائے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن حکیم کی بشارتوں کا مصداق اور مستحق قرار پائیں۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم
ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

●●●●●

طالبانِ علمِ قرآن کیلئے ایک خوش کن خبر!

دورہ ترجمۂ قرآن کے کیسٹ

موجودہ رمضان المبارک میں تراویح کے دوران

ڈاکٹر اسرار احمد (امیر تنظیم اسلامی)

نے ہر چار رکعتوں سے قبل ان میں پڑھے جانے والے حصہ قرآن کا ترجمہ اور آیات اور سورتوں کا باہمی ربط بیان فرمایا جسے ۶۰-۶۰ کے ۸۳ جاپانی و پاکستانی کیسٹوں میں محفوظ کر لیا گیا۔ جنکی قیمت علی الترتیب ۲۰۰/- اور ۱۳۰۰/- روپے ہے خواہشمند حضرات اپنے آرڈر جلد بک کروائیں

۱۔ نشر القرآن کیسٹ سینٹر ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون ۸۵۲۶۱۱ / ۸۵۲۶۸۳

۲۔ شائننگ ٹریڈرز، رفیع مینشن بالمقابل آرام باغ کراچی فون ۷۱۴۷۰۹

قرآن خدا کی کتاب

مولانا وحید الدین خان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دعویٰ کیا کہ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتری ہے تو بہت سے لوگوں نے اس کو نہیں مانا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک انسانی تصنیف ہے نہ کہ خدائی تصنیف۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو قرآن کے مانند ایک کلام بنا کر لاؤ (اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ۔ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ، الطور ۳۴)

اسی کے ساتھ قرآن نے مطلق لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھا ہو جائیں کہ وہ قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ ہرگز نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں (قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا، الاسراء ۸۸) قرآن ایک ابدی کتاب ہے، اس طرح سے یہ ایک ابدی چیلنج ہے۔ قیامت تک کے انسان تمام اسکے مخاطب ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو انسان کے لیے ناقابل تقلید ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں ہم اس کے صرف ایک پہلو کا ذکر کریں گے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء ۸۲)	کیا لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

اس آیت میں "اختلاف" کی تفسیر تفاوت، تعارض، تناقض، تضاد وغیرہ الفاظ سے کی گئی ہے۔ آرتھر آربری نے اختلاف کا ترجمہ نامطابقت (Inconsistency) کیا ہے۔

کلام میں تناقض نہ ہونا ایک انتہائی نادر صفت ہے جو صرف خدائے ذوالجلال کے یہاں پائی جاسکتی ہے۔ کسی انسان کے لیے ایسا کلام تخلیق کرنا ممکن نہیں۔ تناقض سے پاک کلام وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ صاحبِ کلام کا علم ماضی سے مستقبل تک کے امور کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ وہ تمام موجودات کا کلی علم رکھتا ہو۔ وہ چیزوں کی اصل ماہیت سے بلا اشتباہ پوری طرح باخبر ہو۔ اس کا علم براہِ راست واقفیت پر مبنی ہو نہ کہ بالواسطہ معلومات پر۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر یہ انوکھی خصوصیت ہو کہ وہ اشیاء کو غیر متاثر ذہن سے ٹھیک ویسا ہی دیکھ سکتا ہو جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

یہ تمام غیر معمولی اوصاف صرف خدا میں ہو سکتے ہیں۔ کوئی انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا کلام ہر تضاد اور تناقض سے پاک ہوتا ہے۔ انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہوتا اس لیے انسان کا کام کبھی تضاد اور تناقض سے پاک نہیں ہوتا۔

خدائی خاصہ

کلام میں تضاد کا معاملہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں، یہ انسانی فکر کا لازمی خاصہ ہے۔ یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ وہ صرف خدائی فکر کو قبول کرتی ہے۔ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی متوافق نظریہ بنایا جا سکے۔ خدا کے سوا دوسری بنیاد پر جو نظریہ بھی بنایا جائے گا وہ فوراً تضاد کا شکار ہو جائے گا۔ وہ کائنات کے مجموعی ڈھانچہ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔

اس دنیا میں کسی انسانی نظریہ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ فکری تضاد سے خالی ہو سکے۔ اس بات کو ہم یہاں مثال کے ذریعہ واضح کریں گے۔

نظریہ ارتقاء

اس کی ایک مثال حیاتی ارتقاء کا نظریہ ہے۔ ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) اور دوسرے سائنس دانوں نے دیکھا کہ زمین پر جو مختلف انواع حیات موجود ہیں ان میں ظاہری اختلافات کے باوجود حیاتیاتی نظام کے اعتبار سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً گھوڑے کا ڈھانچہ اگر کھڑا کیا جائے تو وہ انسان کے ڈھانچہ سے ملتا جلتا نظر آئے گا۔

اس قسم کے مختلف مشاہدات سے انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان کوئی علیحدہ نوع نہیں۔

انسان اور حیوان دونوں ایک ہی مشترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ رینگنے والے جانور اور چوپائے اور بندر سب حیاتیات کے سفرِ ارتقاء کی پچھلی کڑیاں ہیں۔ اور انسان اس سفرِ ارتقاء کی اگلی کڑی ہے۔

یہ نظریہ ایک سو سال تک انسانی ذہن پر حکمران رہا۔ مگر بعد کو مزید مطالعہ نے بتایا کہ وہ کائنات کے مجموعی نظام سے ٹکرا رہا ہے، وہ اس کے اندر درست نہیں بیٹھتا۔

مثال کے طور پر سائنسی طریقوں کے استعمال سے اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ زمین کی عمر کیا ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً دو ہزار ملین سال پہلے زمین وجود میں آئی۔ یہ مدت ڈارون کے مفروضہ ارتقاء کو ظہور میں لانے کے لیے انتہائی حد تک ناکافی ہے۔ سائنس دانوں نے حساب لگا کر اندازہ کیا ہے کہ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے مرکب کو ارتقائی طور پر وجود میں لانے کے لیے سنکھ ہا سنکھ ملین سال سے بھی زیادہ مدت درکار ہے۔ پھر صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ قسمیں کیسے بن گئیں اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ تکمیل یافتہ قسمیں کیوں کر وجود میں آگئیں۔ اس قلیل مدت میں تو ایک معمولی حیوان بھی نہیں بن سکتا۔ کجا کہ مفروضہ ارتقاء کے مطابق لاتعداد مراحل سے گزر کر انسان ظہور میں آجاتا۔

نظریہ ارتقاء حیاتیاتی عمل میں جن نوعی تبدیلیوں کو فرض کرتا ہے ان کے متعلق ریاضیات کے ایک عالم پاجو (Patau) نے حساب لگایا ہے۔ اس کے مطابق کسی نوع میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کو مکمل ہونے کے لیے دس لاکھ پشتوں کی مدت درکار ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر مفروضہ ارتقائی عمل کے ذریعہ کتے جیسی نسل میں ان گنت تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا بالکل مختلف جانور بننے تو ان کے بننے میں کس قدر زیادہ لمبا عرصہ درکار ہوگا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ نظریہ وضع کیا گیا جس کو پین سپرمیا (Panspermia) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ابتداءً زمین کے باہر بالائی خلا میں کسی مقام پر پیدا ہوئی اور وہاں سے سفر کر کے زمین پر آئی۔ مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کو ملنے میں اور بھی زیادہ بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں۔ زمین کے علاوہ وسیع کائنات کے کسی بھی ستارہ یا سیارہ پر وہ اسباب موجود نہیں ہیں جہاں زندگی جیسی چیز نشو و نما پا سکے۔ مثلاً پانی جو زندگی کے ظہور اور بقا کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے وہ اب تک کی معلومات کے مطابق زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

پھر کچھ ذہین افراد نے فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کا نظریہ وضع کیا۔ اس کے مطابق فرض کیا گیا کہ زندگی یا اس کی انواع بالکل اچانک پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض ایک

نقطہ ہے نہ کہ کوئی علمی نظریہ۔ اچانک پیدائش کبھی اندھے مادی قوانین کے ذریعے ممکن نہیں۔ اچانک پیدائش کا نظریہ لازمی طور پر ایک مداخلت کرنے والے کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی اسی خارجی عامل کا جس کو نہ ماننے کے لیے یہ تمام نظریات گھڑے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی توجیہہ ایک خالق کو مانے بغیر ممکن ہی نہیں۔ خالق کو چھوڑ کر دوسری جو بنیاد بھی تلاش کی جائے گی وہ کائنات کے نقشہ سے ٹکرا جائے گی، وہ اس کے ڈھانچے میں جگہ نہیں پا سکتی۔

انسان کی لاعلمی

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے قاموس جہالت، اس قاموس کی ترتیب میں مختلف شعبوں کے ممتاز اہل علم نے حصہ لیا ہے۔ اس کے تعارف نامہ میں بتایا گیا ہے کہ قاموس جہالت کے سلسلہ میں نہایت معروف سائنس دانوں نے مختلف تحقیقی شعبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ دنیا کے متعلق ہمارے علم میں کون سے بامعنی خلا پائے جاتے ہیں:

In the Encylopaedia of Ignorance some 60 well-known scientists survey different fields of research, trying to point out significant gaps in our knowledge of the world.

یہ کتاب درحقیقت اس واقعہ کا علمی اعتراف ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ کسی بھی میکانیکل توجیہہ کو قبول نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر پروفیسر جان بنارڈ سمتھ نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ نظریہ ارتقاء ناقابل حل اندرونی مسائل (Built-in Problems) سے دوچار ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس نظریات ہیں۔ مگر ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں کہ ہم حسی واقعات سے اپنے نظریات کی تصدیق کر سکیں۔

قرآن کے مطابق انسان اور دوسری تمام انواع خدا کی تخلیق ہیں۔ اس کے برعکس نظریہ ارتقاء زندگی کی تمام قسموں کو اندھے مادی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا جواب اپنی توجیہہ آپ ہے۔ کیونکہ خدا ایک صاحب ارادہ ہستی ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے تحت کسی بھی واقعہ کو ظہور میں لا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ارتقائی عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے اس کا کوئی سبب پایا جائے۔ مگر ایسے اسباب کی دریافت ممکن نہیں اس لیے نظریہ ارتقاء اس دنیا میں بے توجیہہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ارتقاء کا نظریہ لازمی منطقی خلا سے دوچار ہے۔ جبکہ قرآن کے نظریہ میں کوئی منطقی خلا نہیں پایا جاتا۔

علم سیاست

یہی معاملہ فلسفہ سیاسیات کا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار کے الفا
میں، سیاسی فلسفہ اور سیاسی اختلافات بنیادی طور پر ایک ہی سوال کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ کہ کس کو کس کے
اوپر اقتدار حاصل ہو:

Political Philosophy and political conflict have revolved basically around who should have power over whom. (14/697)

اس میدان فکر میں پچھلے پانچ ہزار سال سے اعلیٰ ترین انسانی دماغ اپنی کوششیں صرف کر رہے
ہیں۔ اس کے باوجود علم سیاسیات کا مربوط نظام بنانے کے لیے وہ چیز دریافت نہ ہو سکی جس کو اسپنوزا
نے علمی بنیاد (Scientific Base) کہا ہے۔

علم سیاسیات میں ایک درجن سے زیادہ مدارس فکر پائے جاتے ہیں۔ تاہم وسیع تر تقسیم میں
صرف دو ہیں۔ ایک وہ جو شخصی اقتدار کی وکالت کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جمہوری اقتدار کے حامی
ان دونوں ہی پر سخت ترین اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ شخصی اقتدار کے نظریہ پر یہ اعتراض واقعہ
ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کیوں حاکمانہ اقتدار حاصل ہو۔ چنانچہ وہ کبھی قبولیت
حاصل نہ کر سکا۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جس کو جمہوری اقتدار کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ عملاً اگرچہ یہ ایک مقبول
ہے مگر نظری اور فکری اعتبار سے اس پر سخت ترین شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جمہوریت (ڈیموکریسی) کا نظریہ اسی عقیدہ پر قائم ہے کہ تمام انسان آزاد ہیں اور برابر کے حقوق
رکھتے ہیں۔ روسو کی کتاب معاہدۂ عمرانی (Social Contract) کا پہلا فقرہ یہ ہے:

انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر میں اسکو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں۔

ڈیموکریسی ایک یونانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں حکومت بذریعہ عوام (Rule by the People) مگر عملاً یہ ناممکن ہے کہ تمام عوام کی حکومت قائم ہو سکے۔ سارے لوگوں پر سارے
لوگ آخر کس طرح حکومت کریں گے۔ مزید یہ کہ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی
حیوان (Social Animal) ہے۔ انسان اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے کہ وہ جس طرح چاہے
رہے۔ بلکہ وہ سماجی مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں۔ انسان آزاد نہیں پیدا ہوا۔
انسان ایک سماج کے اندر پیدا ہوا ہے جو کہ اس کے اوپر پابندیاں عائد کرتا ہے:

Man is not born free. Man is born into society, which imposes

restraints on him.

جب سارے عوام بیک وقت حکومت نہیں کرسکتے تو عوامی حکومت کا نظام کس طرح بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریے پیش کیے گئے۔ سب سے زیادہ مقبول نظریہ روسو کا نظریہ ہے جس کو اس نے رائے عامہ (General Will) کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ یہ رائے عامہ حکمران افراد کے انتخاب میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح عوام کی حکومت عملاً منتخب افراد کی حکومت بن جاتی ہے۔ عوام کو انتخاب میں ووٹ دینے کی کسی قدر آزادی ہوتی ہے۔ مگر ووٹ دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے جیسے کچھ افراد کے محکوم بن جاتے ہیں۔ روسو نے اس کا جواب یہ دیا کہ ایک شخص کی خواہش کی پیروی غلامی ہے مگر خود اپنے مقرر کردہ قانون کی پیروی کرنا آزادی ہے:

> To follow one's impulse is slavery but to obey the self-prescribed law is liberty. (15/1172)

ظاہر ہے کہ یہ جواب ناکافی تھا۔ چنانچہ اس نظریہ کو دوبارہ سخت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ خوبصورت الفاظ کے باوجود منتخب جمہوریت عملاً منتخب بادشاہت (Elective Monarchy) کا دوسرا نام ہے۔ انتخاب کے بعد جمہوری افراد وہی کچھ بن جاتے ہیں جو اس سے پہلے شاہی افراد بنے ہوئے تھے۔

اس طرح تمام سیاسی مفکرین تضاد فکری کا شکار ہیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آتا۔ اعتقادی طور پر سب کے سب مساوات انسانی کو اعلیٰ ترین قدر مانتے ہیں۔ مگر انسانی مساوات حقیقی معنوں میں نہ شاہی نظام میں حاصل ہوتی اور نہ جمہوری نظام میں۔ شاہی نظام اگر خاندانی بادشاہت ہے تو جمہوری نظام انتخابی بادشاہت۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں شاہی نظام کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی۔ مگر جب شاہی افراد کی محکومی ختم ہوگئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے لیے دوسرا بدل صرف یہ ہے کہ نمائندہ افراد کی محکومی پر اپنے آپ کو راضی کرلیں۔ دونوں نظاموں میں جو فرق تھا وہ صرف یہ کہ نئے حکمران اپنے کو زمین پر عوام کا نمائندہ کہتے تھے۔ جبکہ پرانے حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نمائندے (Representative of God on Earth) ہیں۔

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس معاملہ میں انسان کی ناکامی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> The History of Political Philosophy from Plato until the present day makes plain that Modern Political Philosophy is still faced with the basic problems. (14/695).

سیاسی فلسفہ کی تاریخ ۔ افلاطون سے لیکر اب تک ، ظاہر کرتی ہے کہ جدید سیاسی فلسفہ ابھی تک بنیادی مسائل سے دوچار ہے ۔

بادشاہت یا جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کا حق انسانوں میں سے کچھ انسان کو دینا پڑتا ہے۔ اس طرح دونوں نظام مساواتِ انسانی کی تردید بن جاتے ہیں۔ جمہوریت عین مساوات انسانی ہی کے نام پر پیش کی گئی۔ مگر وہ اپنے اندرونی تضاد کی وجہ سے برعکس نتیجہ کی حامل ثابت ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی سیاسی فلسفہ ہے جو اس دنیا میں فکری تضاد سے خالی ہو سکتا ہے اور وہ قرآن کا فلسفہ ہے۔ قرآن خدائی حاکمیت کا نظریہ پیش کرتا ہے:

يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا حکم میں ہمارا بھی کچھ
قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ حصہ ہے۔ کہو کہ حکم سب اللہ ہی
(آل عمران ۱۵۴) کا ہے۔

یہ نظریہ فکری تضاد سے پوری طرح خالی ہے۔ جب خدا حاکم اور تمام لوگ محکوم ہوں تو سارے انسان برابر ہو جاتے ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کا تمام فرق مٹ جاتا ہے۔ اب فرق صرف خالق اور مخلوق کے درمیان رہتا ہے نہ کہ مخلوق اور مخلوق کے درمیان۔

خدا کی حاکمیت میں تمام انسان برابر کا درجہ پالیتے ہیں۔ کیونکہ اقتدار انسانوں سے باہر ایک بالاتر ہستی میں تفویض کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس بادشاہت یا جمہوریت میں مساوات کی قدر باقی نہیں رہتی کیوں کہ ان میں ایک انسان کے مقابلہ میں دوسرے انسان کو صاحب اقتدار ماننا پڑتا ہے۔

خدا کی حاکمیت کا نظریہ ایک مربوط نظام فکر بناتا ہے جو ہر قسم کے تضادات سے خالی ہے۔ جب کہ انسانی حاکمیت کا کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو تضاد اور تناقض سے پاک ہو۔

تمام سیاسی نظریات کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کریں مگر انسانی نظام میں یہ تقسیم کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ خواہ جو بھی سیاسی نظام بنایا جائے، بہ صورت ہمیشہ باقی رہے گی کہ کچھ لوگ ایک یا دوسرے نام پر حاکم بن جائیں گے اور بقیہ لوگ محکوم کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔ مگر جب خدا کو حاکم مان لیا جائے تو یہ تقسیم اپنے آپ ختم ہو جاتی ہے۔ اب ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف انسان۔ حاکم اور محکوم کی تقسیم صرف خدا اور انسان کے درمیان رہتی ہے۔ باقی جہاں تک انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ ہے، سب انسان مساوی طور پر یکساں حیثیت کے مالک ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا

ام نہیں کہ خدا کو بادشاہ حقیقی مان کر سب انسان اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دیدیں۔

تضاد کی دو قسمیں

قرآن کی مذکورہ آیت (النساء ۸۲) میں جس تضاد یا نامطابقت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے دو خاص پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔

داخلی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا ایک بیان کتاب کے دوسرے بیان سے ٹکرا رہا ہو۔ خارجی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا بیان خارجی دنیا کے حقائق سے ٹکرا جائے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ان دونوں قسم کے تضادات سے خالی ہے۔ جبکہ کوئی بھی انسانی تصنیف ان سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ اگر وہ ایک انسانی کلام ہوتا تو یقیناً اس کے اندر بھی وہی کمی پائی جاتی جو تمام انسانی کلام میں غیر استثنائی طور پر پائی جاتی ہے۔

داخلی تضاد

کلام میں داخلی تضاد حقیقتاً متکلم کی شخصیت میں داخلی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ داخلی تضاد سے بچنے کے لیے دو چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں۔ ایک کامل علم اور دوسرے کامل موضوعیت (Objectivity)۔ کوئی انسان ان دونوں کمیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی انسان کا کلام داخلی تضاد سے پاک بھی نہیں ہوتا۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام کمیوں سے پاک ہے۔ اس لیے صرف خدا کا کلام ہے جو داخلی تضاد سے پوری طرح خالی ہے۔

انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے بہت سی باتوں کو اپنی عقل کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ اس لیے وہ قیاسی طور پر کبھی وہ ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری بات۔ ہر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ناپختہ عمر سے پختہ عمر کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناپختہ عمر میں جو بات کہتا ہے، پختہ عمر میں پہنچ کر وہ خود اس کے خلاف بولنے لگتا ہے۔ ہر آدمی کا علم اور تجربہ بڑھتا رہتا ہے اس بنا پر اس کا کوئی کلام کچھ ہو جاتا ہے اور آخری کلام کچھ۔ انسان کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ اس کی واقفیت ابھی پوری نہیں ہوتی کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنی نامکمل واقفیت کی بنا پر ایسی بات کہتا ہے جو اس جدید درست ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح آدمی کو کسی سے دوستی ہوتی ہے اور کسی سے دشمنی۔ وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی

سے نفرت۔ وہ کسی کے بارے میں سادہ ذہن کے تحت سوچتا ہے اور کسی کے بارے میں ردعمل کی نفسیا
کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان پر کبھی غم کا لمحہ گزرتا ہے اور کبھی خوشی کا۔ وہ کبھی ایک ترنگ میں ہوتا ہے اور
کبھی دوسری ترنگ میں۔ اس بنا پر انسان کے کلام میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی ایک طرح کی بات
کہتا ہے اور کبھی دوسری طرح کی۔

خدا ان تمام کمیوں سے پاک ہے، اس لیے اس کا کلام ہمیشہ یکساں ہوتا ہے اور ہر قسم کے تناقض
سے خالی بھی۔

حضرت مسیح کی شخصیت

مثال کے طور پر بائبل کو لیجئے۔ بائبل اپنی ابتدائی حالت میں خدا کا کلام تھی۔ مگر بعد کو اس میں انسا
ملاوٹ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کثرت سے داخلی تضادات پیدا ہو گئے۔ بائبل کا وہ حصہ
جس کو انجیل یا نیا عہد نامہ کہا جاتا ہے۔ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ دیا گیا ہے۔ یہ نسب نا
متی کی انجیل میں اس طرح شروع ہوتا ہے:

یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ

یہ مختصر نسب نامہ ہے۔ اس کے بعد انجیل میں مفصل نسب نامہ ہے جو حضرت ابراہیم سے شرو
ہوتا ہے۔ اور آخر میں "یوسف" پر ختم ہوتا ہے جو اس کے بیان کے مطابق مریم کے شوہر تھے جن سے
حضرت مسیح پیدا ہوئے۔

اس کے بعد فاری مرقس کی انجیل تک پہنچتا ہے تو وہاں کتاب کے آغاز میں حضرت مسیح کا نسب
ان لفظوں میں ملتا ہے:

یسوع مسیح ابن خدا

گویا انجیل کے ایک باب کے مطابق حضرت مسیح یوسف نامی ایک شخص کے فرزند تھے۔ اور
انجیل کے دوسرے باب کے مطابق حضرت مسیح ابن خدا (خدا کے بیٹے) تھے۔

انجیل اپنی ابتدائی صورت میں یقیناً خدائی کلام تھی اور تضادات سے پاک تھی۔ مگر بعد کو اس میں
انسانی کلام شامل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیانات میں تضاد پیدا ہو گیا۔

انجیل کے اس تضاد کی تاویل کلیسا نے ایک اور عجیب و غریب تضاد سے کی ہے۔ چنانچہ انسائیکلو
پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مطابق وہ مذکورہ یوسف کے لیے حسب ذیل الفاظ استعمال کرتے ہیں اگر
وہ

Christ's Earthly Father, The Virgin Mary's Husband.

مسیح کا ارضی باپ، کنواری مریم کا شوہر۔

کارل مارکس کا فکری تضاد

یہ مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال تھی - اب غیر مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال لیجئے۔ یہاں
نں کارل مارکس کا حوالہ دوں گا۔ موجودہ زمانہ میں مارکس کی ذہنی عظمت کا حال یہ ہے کہ امریکی پروفیسر
ن گال بریتھ نے مارکس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔

> If we agree that the Bible is a work of collective authorship, only Mohammad Rivals Marx in the number of professed and devoted followers recruited by a single author. And the competition is not really very close. The followers of Marx now far outnumber the sons of the Prophet.
>
> John Kenneth Galbraith, The Age of Uncertainty British Broadcasting Corporation, 35 Marylebone High Street London, Wim 4 AA, P. 77.

اگر ہم یہ مان لیں کہ بائبل کئی اشخاص کی مشترکہ تصنیف ہے تو صرف محمد وہ دوسرے واحد مصنف
ہے جو معتقدین اور پیروؤں کی تعداد کے اعتبار سے مارکس کی برابری کر سکتے ہیں۔ پھر مقابلہ زیادہ قریب
ب کا نہیں۔ مارکس کے پیروؤں کی تعداد آج پیغمبر کے پیروؤں کی تعداد سے بہت بڑھ چکی ہے۔
مگر ساری مقبولیت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مارکس کا کلام داخلی تضاد کا شاہکار ہے۔
س کے فکر میں اتنے زیادہ تضادات پائے جاتے ہیں کہ اس کے خیالات کو مجموعہ اضداد کہنا زیادہ
ح ہوگا۔

مثال کے طور پر مارکس نے دنیا کی تمام سماجی خرابیوں کا سبب سماج میں طبقات کا ہونا بتایا
ہے۔ یہ طبقات اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کے نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک
بقہ (بورژوا یا سرمایہ دار) ذرائع پیداوار پر قابض ہو کر دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔
اس کا حل مارکس نے یہ تجویز کیا کہ سرمایہ دار طبقہ سے اس کی ملکیتیں چھین لی جائیں اور ان کو
دور طبقہ کے زیر انتظام دیدیا جائے۔ اس کارروائی کو وہ بے طبقاتی سماج (Classless Society)
یں کرنے کا نام دیتا ہے مگر یہ کھلی ہوئی تضاد فکری ہے۔ کیونکہ مذکورہ کارروائی سے جو چیز وقوع میں آئے
وہ بے طبقاتی سماج نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ معاشی ذرائع پر ایک طبقہ کا قبضہ ختم ہو کر دوسرے

طبقہ کا قبضہ شروع ہو جائے۔ یہ طبقات کا خاتمہ نہیں بلکہ صرف طبقات کی تبدیلی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ قبضہ ملکیت کے نام پر تھا اور اب یہ قبضہ انتظام کے نام پر ہوگا۔ وہ چیز جس کو مارکس بے طبقاتی سماج کہتا ہے وہ عملاً سرمایہ دار طبقہ کی ملکیت کو ختم کر کے کمیونسٹ طبقہ کی ملکیت قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

مارکس ایک ہی چیز کو ایک جگہ برائی کہتا ہے اور دوسری جگہ بھلائی۔ مگر سرمایہ داروں کے خلاف شدید نفرت اور تعصب کی وجہ سے اس کو اپنا یہ فکری تضاد دکھائی نہیں دیا۔ وہ ذرائع معاش کو سرمایہ داروں کے بجائے عہدیداروں کے قبضہ میں دے رہا تھا۔ مگر اپنے متعصبانہ اندھے پن کی وجہ سے وہ اپنے اس تضاد کو محسوس نہ کر سکا۔ ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں سے ایک واقعہ کو اس نے انفرادی لوٹ کہا اور دوسرے کو اجتماعی تنظیم۔

قرآن اس قسم کے داخلی تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے۔ اس کا کوئی بیان اس کے دوسرے بیان سے نہیں ٹکراتا۔ قرآن کے تمام بیانات میں کامل قسم کی داخلی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

غیر متعلق مثال

قرآن کے مخالفین نے اس سلسلہ میں بعض مثالیں دے کر قرآن کے اندر داخلی تضاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ تمام کی تمام غیر متعلق مثالیں ہیں۔ گہرا تجزیہ یہ فوراً ان کی غلطی واضح کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن نے ایک طرف یہ اعلیٰ اصول پیش کیا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (النساء ۱) حدیث (خطبہ حجۃ الوداع) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے تھے (اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ) اس اصول کے مطابق عورت کا بھی وہی درجہ ہونا چاہیے جو مرد کا درجہ ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔ ایک طرف قرآن مساوات انسانی کا علم بردار ہے اور دوسری طرف اس نے عورت کو سماج میں کمتر مقام دیدیا۔ چنانچہ گواہی کے معاملہ میں یہ قانون مقرر کیا کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی جائیگی۔

یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام میں عام حالات میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے مگر اس کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ قطعی طور پر دوسری ہے۔ یہ حکم قرآن کی جس آیت میں ہے وہیں اس کی وجہ بھی بتا دی گئی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (البقرہ ۲۸۲)

(جب تم ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو) اور اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنا لو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔

آیت کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اس حکم کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں بلکہ صرف یادداشت پر ہے۔ آیت اس حیاتیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عورتوں کی یادداشت عام طور پر مردوں سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے قرض کے معاملہ میں عورت کو گواہی میں لینا ہو تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ تاکہ آئندہ جب کبھی گواہی دینا ہو تو دونوں مل کر ایک دوسرے کی یادداشت کی کمی کی تلافی کر سکیں۔

یہاں میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی یادداشت کم ہوتی ہے۔ روس میں اس موضوع پر باقاعدہ سائنسی تحقیق کی گئی ہے اور نتائج تحقیق کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس تحقیق کا خلاصہ اخبارات میں آچکا ہے۔ نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵) میں یہ خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memorise and process mathematical information than women, but females are better with words, A Soviet Scientist says, reports UPI. 'Men dominate mathematical subjects due to the peculiarities of their memory', Dr. Vladimir Konovalov told the Tass News Agency.

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنسدان نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونوولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چلتے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (البقرہ ۲۸۲)	(جب تم ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو) اور اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنا لو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔

آیت کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اس حکم کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں بلکہ صرف یادداشت پر ہے۔ آیت اس حیاتیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عورتوں کی یادداشت عام طور پر مردوں سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے قرض کے معاملہ میں عورت کو گواہی میں لینا ہو تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ تاکہ آئندہ جب کبھی گواہی دینا ہو تو دونوں مل کر ایک دوسرے کی یادداشت کی کمی کی تلافی کر سکیں۔

یہاں میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی یادداشت کم ہوتی ہے۔ روس میں اس موضوع پر باقاعدہ سائنسی تحقیق کی گئی ہے اور نتائج تحقیق کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس تحقیق کا خلاصہ اخبارات میں آچکا ہے۔ نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵) میں یہ خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memorise and process mathematical information than women, but females are better with words, A Soviet Scientist says, reports UPI. 'Men dominate mathematical subjects due to the peculiarities of their memory', Dr. Vladimir Konovalov told the Tass News Agency.

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنسدان نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونوولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چلتے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔

جب یہ ایک حیاتیاتی واقعہ ہے کہ عورت کی یادداشت فطری طور پر مرد سے کم ہوتی ہے تو یہ عین مطابق حقیقت بات ہے کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر رکھی جائے۔ قرآن کا یہ قانون قرآن میں تضاد ثابت نہیں کرتا بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے جو تمام حقیقتوں سے باخبر ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے احکام میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت پائی جاتی ہے۔

خارجی نامطابقت

اس معاملہ کا دوسرا پہلو خارجی نامطابقت ہے۔ یعنی کسی امر میں کتاب کے اندر جو بات کہی گئی ہے وہ کتاب کے باہر پائی جانے والی حقیقت کے مطابق نہ ہو۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جو تمام انسانی تصنیفات میں پائی جاتی ہے۔ انسان اپنی معلومات کے دائرہ میں بولتا ہے۔ اور انسان کی معلومات کا دائرہ چونکہ محدود ہے اس لیے اس کی زبان یا قلم سے ایسی باتیں نکلتی رہتی ہیں جو خارجی صورتِ حال سے مطابقت رکھتی ہوں۔

یہاں ہم چند تقابلی مثالیں بیان کریں گے۔

قانونِ فطرت کی مثال

۱۔ قدیم عرب میں ایک رواج یہ تھا کہ بعض اوقات کوئی شخص اپنی اولاد کو اس اندیشہ سے قتل کر دیتا تھا کہ افرادِ خاندان زیادہ ہو جائیں گے تو ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام نہ ہو سکے گا۔ اس سلسلہ میں قرآن میں یہ حکم اترا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ۔ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (الاسراء ۳۱)

اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو۔ ہم انکو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی۔ بے شک انکو مار ڈالنا ایک بڑی خطا ہے۔

یہ اعلان گویا ایک قسم کا دعویٰ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مستقبل میں آبادی کا کوئی بھی اضافہ زمین پر رزق کی تنگی کا مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔ انسانی تعداد کے مقابلہ میں غذائی اشیاء کا تناسب ہمیشہ موافق طور پر برقرار رہے گا۔ جس طرح آج سب کو ان کی روزی مل رہی ہے اسی طرح آئندہ بھی سب کو ان کی روزی ملتی رہے گی۔

مسلمان ہر دور میں اعتقادی طور پر اس اعلان کی صداقت کو مانتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی بھی وہ ذہن پیدا نہیں ہوا جس کو موجودہ زمانہ میں تحدید نسل یا برتھ کنٹرول کہتے ہیں۔ وہ خُدا کی رزاقی پر بھروسہ کرتے ہوئے رزق کے معاملہ کو خُدا پر چھوڑتے رہے ہیں۔ مگر اس اعلان کے ایک ہزار سال بعد انگریز ماہر معاشیات رابرٹ مالتھس (۱۸۳۴ - ۱۷۶۶) پیدا ہوا۔ ۱۷۹۸ میں "اصول آبادی" پر اس کی مشہور کتاب چھپی جس کا پُورا نام یہ تھا:

An essay on the Principle of Population as it affects the Future Improvement of Society.

مالتھس نے اپنی اس کتاب میں وہ مشہور نظریہ پیش کیا جس کا خلاصہ اس کے الفاظ میں یہ تھا:

Population, when unchecked, increases in a geometrical ratio. Subsistence only increases in an arithmatical ratio.

آبادی، جب کہ وہ بے قید طور پر چھوڑ دی جائے، جیومیٹری کے تناسب سے بڑھتی ہے۔ اشیاء خوراک صرف ارتھمیٹک کے تناسب سے بڑھتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اضافہ اور غذائی اشیاء کا اضافہ قدرتی طور پر یکساں نہیں ہے۔ انسانی آبادی کا اضافہ ۱-۲-۴-۸-۱۶-۳۲-۶۴ کے تناسب سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غذائی اشیاء میں اضافہ کا تناسب ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸ رہتا ہے۔ یعنی انسانی آبادی میں اضافہ نہایت تیز رفتار ہوتا ہے اور غذائی اشیاء میں اضافہ نہایت سُست رفتار۔ اس بنا پر مالتھس نے کہا کہ زمین پر انسانی نسل کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ پیدائش پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ انسان کی تعداد کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ ورنہ بہت جلد ایسا ہوگا کہ آبادی اور غذائی اشیاء میں غیر متناسب اضافہ کی وجہ سے فاقہ کا دور شروع ہو جائے گا اور بے شمار انسان بھوک سے مرنے لگیں گے۔

مالتھس کی اس کتاب نے دنیا کی فکر پر زبردست اثر ڈالا۔ اس کی تائید میں بے شمار لکھنے اور بولنے والے پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ مگر اب محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کا اندازہ سراسر غلط تھا۔ مسٹر گوائن ڈائر (Gwynne Dyer) کا خلاصہ ایک مقالہ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس مقالہ کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے:

(Malthus: The False Prophet)

مقالہ نگار جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

It is the 150th anniversary of Malthus's death, and his grim predictions have not yet come true. The world's population has doubled and reboulded in a geometrical progression as he foresaw, only slightly checked by wars and other catastrophes, and now stands at about eight times the total when we wrote. But food production has more than kept pace, and the present generation of humanity is on average the best fed in history.

مالتھس کی موت کو اب ۱۵۰ سال گزر چکے ہیں اور اس کی سنگین پیشین گوئیاں ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔ دنیا کی آبادی جیومیٹری کے حساب سے دگنا اور چوگنا ہو گئی جیسا کہ اس نے کہا تھا، اس میں جنگوں اور حوادث کی وجہ سے بس تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔ جب مالتھس نے اپنی کتاب لکھی تھی اس وقت کی آبادی کے مقابلہ میں آج دنیا کی آبادی تقریباً آٹھ گنا ہو چکی ہے۔ مگر غذائی پیداوار بھی کچھ اضافہ ہی کے ساتھ بڑھتی رہی ہے۔ اور انسان کی موجودہ نسل کو اوسط طور پر تاریخ کی سب سے بہتر غذا مل رہی ہے (ہندوستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴)۔

رابرٹ مالتھس "روایتی زراعت" کے دور میں پیدا ہوا۔ وہ اس کا اندازہ نہ کر سکا کہ جلد ہی "سائنٹفک زراعت" کا دور آنے والا ہے جس کے بعد پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کرنا ممکن ہو جائے گا۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں زراعت کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اب ایسے منتخب بیج بوئے جاتے ہیں جو زیادہ فصل دینے والے ہوں۔ یہی معاملہ مویشیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کھیتوں کو زرخیز کرنے کے مزید طریقے دریافت ہو گئے ہیں۔ نئی نئی کھادیں بڑے پیمانے پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ مشین کی مدد سے ان مقامات پر کھیتی ہونے لگی ہے جہاں پہلے کھیتی کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ آج ترقی یافتہ ملکوں میں کسانوں کی تعداد میں ۹۰ فی صد تک کمی کرنے کے باوجود زرعی پیداوار کو دس گنا تک بڑھا لیا گیا ہے۔ وغیرہ

تیسری دنیا (غیر ترقی یافتہ ممالک) کا جو رقبہ ہے اس کے لحاظ سے اس میں ۳۳ بلین انسانوں کی آبادکاری کی گنجائش ہے جبکہ اس کی موجودہ آبادی صرف ۳ بلین ہے۔ تیسری دنیا امکانی طور پر اپنی موجودہ آبادی کی دس گنا تعداد کو خوراک مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایف اے او نے اندازہ لگایا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کی آبادی اگر بے قید طور پر بڑھتی رہے اور ۲۰۰۰ء میں چار بلین سے زیادہ ہو جائے تب بھی کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ کیونکہ اندازہ کے مطابق، اس وقت جو آبادی

ہوگی اس سے ڈیڑھ گنا آبادی کو خوراک مہیا کرنے کے ذرائع پھر بھی تیسری دنیا کے علاقہ میں موجود ہوں گے۔

خوراک میں یہ اضافہ جنگلوں کو کاٹے بغیر ممکن ہو سکے گا۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ نہ تو عالمی سطح پر کسی غذائی بحران کا کوئی حقیقی اندیشہ ہے اور نہ علاقائی سطح پر۔ مسٹر گرائن ڈائر نے اپنی رپورٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے :

Malthus was wrong. We are not doomed to breed ourselves into famine.

مالتھس غلطی پر تھا۔ ہمارے لیے یہ مقدر نہیں کہ ہماری اگلی نسلیں قحط میں پیدا ہوں۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مالتھس کی کتاب "اصول آبادی" انسانی ذہن کی پیداوار تھی جو زمان و مکان کے اندر رہ کر سوچتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جو زمان و مکان سے بلند ہو کر سوچنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی فرق اس بات کا سبب ہے کہ مالتھس کا کام خارجی حقیقت سے ٹکرا گیا اور قرآن آخری حد تک خارجی حقیقتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

کتبِ مقدسہ کی مثال

۲۔ بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانہ میں ۲۰ ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں داخل ہوئے۔ اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں گئے۔ یہ دونوں واقعات بائبل میں بھی مذکور ہیں اور قرآن میں بھی، مگر قرآن کے بیانات خارجی تاریخ سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ جب کہ بائبل میں کئی ایسی باتیں ہیں جو خارجی تاریخی واقعات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ بائبل کے معتقدین کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بائبل کے بیان کو لیں یا تاریخ کے بیان کو۔ کیونکہ دونوں کو بیک وقت لینا ممکن نہیں۔

۱۲ جنوری ۱۹۸۵ کو نئی دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (تغلق آباد) میں اجتماع تھا۔ اس اجتماع کے مقرر مسٹر عذرا کولٹ (Ezra Kolet) تھے۔ جو ہندوستان میں آباد یہودیوں کی مجلس (Council of Indian Jewry) کے صدر ہیں۔ تقریر کا عنوان تھا :

'What is Judaism'

یہودی مقرر نے اپنی تقریر میں قدرتی طور پر یہودیوں کی تاریخ بیان کی۔ انہوں نے مصر میں ان کے

جانے اور پھر وہاں سے نکلنے کا بھی تذکرہ کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کا ذکر آیا تو انہوں نے حضرت یوسف کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہا اور حضرت موسیٰ کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون بتایا۔

ہر صاحب علم جانتا ہے کہ یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ "فرعون" نام کے بادشاہ صرف بعد کو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ہوئے۔ اس سے پہلے حضرت یوسف کے زمانہ میں دوسرے لوگ مصر کے حکمران تھے۔

حضرت یوسف جس زمانہ میں مصر میں داخل ہوئے اس زمانہ میں وہاں ان لوگوں کی حکومت تھی جن کو تاریخ میں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور باہر سے آکر مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لیکر پندرھویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر میں حکمران رہا۔ اس کے بعد مصر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور ہکسوس کی حکومت ختم کر دی گئی۔

اس کے بعد مصر میں ملک والوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت جس خاندان کو مصر کی بادشاہی ملی اس نے اپنے حکمرانوں کے لیے فرعون کا لقب پسند کیا۔ فرعون کے لفظی معنی سورج دیوتا کی اولاد کے ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے لوگ سورج کو پوجتے تھے۔ چنانچہ حکمرانوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہیں۔ تاکہ مصریوں کے اوپر اپنا حق حکومت ثابت کیا جا سکے۔

مسٹر عذرا کولٹ نے جو کچھ کیا وہ مجبور تھے کہ ویسا ہی کریں۔ کیونکہ بائبل میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ بائبل حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ مسٹر عذرا کولٹ یا تو بائبل کو لے سکتے تھے یا تاریخ کو۔ دونوں کو ساتھ لینا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے یہودی کونسل کا صدر ہونے کی حیثیت سے تاریخ کو چھوڑا اور بائبل کو اختیار کر لیا۔

مگر قرآن اس قسم کے اختلاف بیانی سے خالی ہے۔ اس لیے حاملین قرآن کے لیے یہ مسئلہ نہیں کہ قرآن کو لینے کے لیے انہیں تاریخی حقیقت کو چھوڑنا پڑے۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں یہ تاریخی واقعات لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ یہ تاریخ ابھی تک قدیم آثار کی صورت میں زمین کے نیچے دفن تھی جن کو بہت بعد کو زمین کی کھدائی سے برآمد کیا گیا۔ اور ان کی بنیاد پر مصر کی

تاریخ مرتب کی گئی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو قرآن اس کے لیے مَلِکِ مِصر (مِصر کا بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اس کو بار بار فرعون کہتا ہے۔ اس طرح قرآن کا بیان خارجی تاریخی حقیقت کے عین مطابق ٹھہرتا ہے۔ جبکہ بائبل کا بیان خارجی تاریخی حقیقت سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جو انسانی معلومات کے ماوراء تمام حقیقتوں کو براہِ راست دیکھ رہا ہے۔

تاریخ کی مثال

۳۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور حیوان دونوں ایک مشترک مورث اعلیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیوانات کی ایک نسل ترقی کرتے کرتے بندر (چمپینزی) تک پہنچی۔ اور بندر کی یہ نسل مزید ترقی کرتے کرتے انسان بن گئی۔

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو حیوان اور انسان کی درمیانی کڑیاں کہاں ہیں۔ یعنی وہ انواع کون سی ہیں جو ابھی ارتقاء کے درمیانی سفر میں تھیں اور اس بنا پر ان کے اندر کچھ حیوانی پہلو تھے اور کچھ انسانی پہلو۔ اگرچہ حقیقی طور پر ابھی ایسی کوئی درمیانی نوع دریافت نہیں ہوئی ہے، تاہم علماءِ ارتقاء کو یقین ہے کہ ایسی انواع گزری ہیں۔ البتہ ان کا سراغ انھیں ابھی تک نہیں ملا ہے، ان مفروضہ کڑیوں کو غلط طور پر گم شدہ کڑیوں (Missing Links) کا نام دیا گیا ہے۔

۱۹۱۲ میں لندن کے اخبارات نے پرجوش طور پر یہ خبر دی کہ بندر اور انسان کے درمیان کی ایک گم شدہ کڑی دریافت ہو گئی ہے۔ یہ وہی کڑی ہے جس کو ارتقاء کی تاریخ میں پلٹ ڈاؤن انسان (Piltdown Man) کہا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ تھی کہ لندن کے برٹش میوزیم کو قدیم زمانہ کا ایک جبڑا ملا جس کا ڈھانچہ بندر جیسا تھا مگر اس کا دانت انسان کے دانت سے مشابہ تھا۔ اس ہڈی کے ٹکڑے کی بنیاد پر ایک پوری تصویر بنائی گئی جو دیکھنے والوں کو بندر نما انسان یا انسان نما بندر دکھائی دیتی تھی۔ اس کو پلٹ ڈاؤن انسان کا نام دیا گیا۔ کیونکہ وہ پلٹ ڈاؤن نامی مقام سے

حاصل ہوا تھا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کو تیزی سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ باقاعدہ طور پر نصاب کی کتابوں میں شامل کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر آر ایس لل (R. S. Lull) کی کتاب عضویاتی ارتقاء (Organic Evolution) میں۔ بڑے بڑے علماء و مفکرین نے اس کو جدید انسان کی علمی فتوحات میں شمار کیا۔ مثلاً ایچ جی ویلس (۱۹۴۶ - ۱۸۶۶) نے اپنی کتاب تاریخ کا خاکہ (The Outline of History) میں۔ اور برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) نے اپنی کتاب مغربی فلسفہ کی تاریخ (A History of Western Philosophy) میں۔ تاریخ اور حیاتیات کی کتابوں میں پلٹ ڈاؤن انسان کا ذکر اس طرح کیا جانے لگا جیسے کہ وہ ایک مسلمہ حقیقت ہو۔

تقریباً نصف صدی تک جدید علماء اس "عظیم دریافت" سے مسحور رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۳ میں بعض علماء کو شبہہ ہوا۔ انہوں نے برٹش میوزیم کے آہنی فائر پروف بکس سے مذکورہ جبڑا نکالا۔ اس کو سائنسی طریقہ سے جانچا۔ تمام متعلق پہلوؤں سے اس کی تحقیق کی۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مکمل طور پر ایک فریب تھا جس کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کی اصل حقیقت یہ تھی کہ ایک شخص نے بندر کا ایک جبڑا لیا۔ اس کو مہوگنی رنگ میں رنگا اور پھر اس کے دانت کو ریتی سے گھس کر آدمی کے دانت کی طرح بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے یہ جبڑا یہ کہہ کر برٹش میوزیم کے حوالے کر دیا کہ یہ اس کو پلٹ ڈاؤن (انگلینڈ) میں ملا ہے۔

یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے چند حوالے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1. Encylopaedia Britanica (1984) "Piltdown Man"
2. Bulletin of the British Museum (Natural History) Vol. 2, No. 3 and 6
3. J.S. Weiner, The Piltdown Forgery (1955)
4. Ronald Millar, The Piltdown Men (1972).
5. Readers Digest November 1956.

فرعونِ موسیٰ

اس کے مقابلہ میں اب قرآن سے اسی نوعیت کی ایک مثال لیجئے۔ یہ فرعونِ موسیٰ کی مثال ہے۔ اس کے بارہ میں قرآن میں جو الفاظ آئے تھے، بعد کی تاریخ حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق بن گئی۔

تاریخ کے مطابق حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مصر کا جو بادشاہ غرق ہوا وہ رعمیسس دوم کا فرزند تھا۔ اس کا خاندانی لقب فرعون اور ذاتی نام مرنفتاح (MERNAPTAH) تھا۔ نزول قرآن کے وقت اسی فرعون کا ذکر صرف بائبل کے مخطوطات میں تھا۔ اس میں بھی صرف یہ لکھا تھا کہ "خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور فرعون کے سارے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا (خروج ۱۴ : ۲۸) اس وقت قرآن نے حیرت انگیز طور پر یہ اعلان کیا کہ فرعون کا جسم محفوظ ہے اور وہ دنیا والوں کے لیے سبق بنے گا:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً۔	آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی ہو۔

(یونس : ۹۲)

قرآن میں جب یہ آیت اتری تو وہ نہایت عجیب تھی۔ اس وقت کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ فرعون کا جسم کہیں محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس آیت کے نزول پر اسی حالت میں تقریباً چودہ سو سال گزر گئے۔ پروفیسر لاریٹ (Loret) پہلا شخص ہے جس نے ۱۸۹۸ میں مصر کے ایک قدیم مقبرہ میں داخل ہو کر دریافت کیا کہ یہاں مذکور رہ فرعون کی لاش ممی کی ہوئی موجود ہے۔ ۸ جولائی ۱۹۰۷ کو ایلیٹ اسمتھ (Elliot Smith) نے اس لاش کے اوپر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹایا۔ اس نے اس کی باقاعدہ سائنسی تحقیق کی اور پھر ۱۹۱۲ میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے شاہی ممیاں (The Royal Mummies) اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ممی کی ہوئی لاش اسی فرعون کی ہے جو تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں غرق کیا گیا تھا۔ ایک مغربی مفکر کے الفاظ ہیں:

"His earthly remains were saved by the Will of God from destruction to become a sign to man, as it is written in the Qur'an."

فرعون کا مادی جسم خدا کی مرضی کے تحت برباد ہونے سے بچالیا گیا تاکہ وہ انسان کے لیے ایک نشانی ہو، جیسا کہ وہ قرآن میں لکھا ہوا ہے۔

قرآن اور بائبل اور سائنس (The Bible, The Quran, and Science) کے مصنف ڈاکٹر موریس بوکیل (Maurice Bucaille) نے ۱۹۷۵ میں فرعون کی اسی لاش کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب میں اس پر جو باب لکھا ہے اس کا خلاصہ ان ممتاز سطروں پر ہوا ہے:

Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Qur'an dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo!

وہ لوگ جو مقدس کتابوں کی سچائی کے لیے جدید ثبوت چاہتے ہیں وہ قاہرہ کے مصری عجائب خانہ میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں، وہاں وہ قرآن کی ان آیتوں کی شاندار تصدیق پائیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے بحث کرتی ہیں۔

قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں کہا کہ فرعون کا جسم لوگوں کی نشانی کے لیے محفوظ ہے، اور وہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں نہایت صحت کے ساتھ برآمد ہوگیا۔ دوسری طرف موجودہ زمانہ کے علماء سائنس نے اعلان کیا کہ پلیٹ ڈاؤن کے مقام پر انہوں نے ایک ڈھانچہ دریافت کیا ہے جو قدیم انسان کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اور اگلی معلومات کے تحت وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوگیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے کہ قرآن ایک خدائی کتاب ہے۔ وہ عام انسانی تصنیفات کی طرح کوئی انسانی تصنیف نہیں۔

علم الحیات کی مثال

قدیم زمانہ میں جب کہ موجودہ سائنسی مشاہدات سامنے نہیں آتے تھے، ساری دنیا میں توہماتی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ لوگوں نے بلاتحقیق عجیب عجیب نظریات قائم کر لیے تھے۔ یہ نظریات دوبارہ وقت کی کتابوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ جو شخص بھی اس زمانہ میں کوئی کتاب لکھتا تو ماحول کے زیر اثر وہ ان خیالات کو بھی دہرانے لگتا تھا۔

مثال کے طور پر ارسطو (۳۲۲-۳۸۴ ق م) نے ایک موقع پر پیٹ میں پرورش پانے والے بچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ وقت کے رواجی فکر کے مطابق یہ کہتا ہے کہ پیٹ کے بچوں کی صحت کا تعلق ہواؤں سے ہے۔ ارسطو کے اس خیال کا مذاق اڑاتے ہوئے برٹرنڈ رسل نے لکھا ہے:

He said that children will be healthier if conceived when the wind is in the north. One gathers that the two Mrs Aristotles both had to run out and look at the weathercock every evening before going to bed. (P. 17).

ارسطو نے کہا کہ بچے زیادہ تندرست ہوں گے اگر شمالی رخ پر ہوا چلنے کے وقت ان کا عمل قرار پائے۔ ایک شخص اس سے قیاس کر سکتا ہے کہ ارسطو کی دونوں بیویاں ہر شام کو بستر پر جانے سے پہلے دوڑ کر باہر جاتی ہوں گی اور دیکھتی ہوں گی کہ ہوا کا رخ کس سمت میں ہے

قرآن اسی قدیم زمانہ میں اُترا۔ اس میں علم کی مختلف شاخوں سے متعلق کثرت سے حوالے موجود ہیں۔ مگر قرآن میں کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی جس میں وقت کے رواجی خیالات کا انعکاس پایا جاتا ہو۔

اجسامِ فلکی کی گردش

قرآن (الانبیاء ۳۳، یٰسین ۴۰) میں سورج اور چاند کا ذکر کر کے ارشاد ہوا ہے کہ سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں (كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ) ڈاکٹر مورلیس بوکیل نے ان آیات پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور دکھایا ہے کہ یہاں فلک سے وہی چیز مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مدار (Orbit) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

It is shown that the sun moves in an orbit, but no indication is given as to what this orbit might be in relation to the Earth. At the time of the Qur'anic Revelation, it was thought that the Sun moved while the Earth stood still. This was the system of geocentrism that had held away since the time of Ptolemy, second century B.C., and was to continue to do so until Copernicus in the sixteenth century A.D. Although people supported this concept at the time of Muhammad, it does not appear anywhere in the Qur'an, either here or elsewhere. (P. 159).

مذکورہ آیات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سورج ایک مدار میں گھومتا ہے۔ مگر اس بات کا کوئی اشارہ نہیں دیا گیا ہے کہ زمین کی نسبت سے اس کا مدار کیا ہے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج (زمین کے گرد) گھوم رہا ہے، جب کہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ مرکزیت ارضی کا نظام تھا جو دوسری صدی قبل مسیح میں ٹالمی کے زمانہ سے چھایا گیا تھا۔ وہ سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس تک باقی رہا۔ اگرچہ محمد کے زمانہ میں لوگ اس نظریہ کی تائید کرتے تھے مگر قرآن میں وہ کہیں ظاہر نہیں ہوا۔ نہ ان دونوں آیتوں میں اور

…لسی اور آیت ہیں۔

جنینی ارتقاء

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال وہ ہے جو ۱۹۸۴ کے آخر میں مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ کناڈا کے اخبار دی سٹی زن (۲۲ نومبر ۱۹۸۴) نے اس کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی:

Ancient Holy Book 1300 Years Ahead of its time.

(قدیم مقدس کتاب اپنے وقت سے ۱۳ سو سال آگے) اسی طرح نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر حسب ذیل سرخی کے ساتھ چھپی:

Kor'an Scores over Modern Science

قرآن جدید سائنس پر بازی لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور جنینیات کے ماہر ہیں اور کناڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے قرآن کی چند آیات (المؤمنون ۱۴، الزمر ۶) اور جدید تحقیقات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی (جدہ) بھی گئے۔ انہوں نے پایا کہ قرآن کا بیان حیرت انگیز طور پر جدید دریافتوں کے عین مطابق ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں سخت تعجب ہوا کہ قرآن میں بیان کردہ حقیقتیں موجود ہیں جو مغربی دنیا نے پہلی بار صرف ۱۹۴۰ میں معلوم کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں وہ مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

The 1300 years old Koran contains passages so accurate about embryonic development that Moslems can reasonably believe them to be revelations from God.

۱۳ سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقاء کے بارہ میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی آیتیں ہیں۔

(یہ مضمون زیادہ مفصل طور پر ماہنامہ الرسالہ میں شائع کیا جا رہا ہے)

نیوٹن کا نظریہ نور

انسان جب بھی کسی مسئلہ پر کلام کرتا ہے تو فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ "حال" میں بول رہا ہے۔ اسے

مستقبل کی کوئی خبر نہیں۔ کوئی انسان آئندہ ظاہر ہونے والی حقیقتوں کو نہیں جانتا اس لیے وہ اپنے کلام میں ان کی رعایت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ایسا معیار ہے جس پر آدمی ہمیشہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر ماضی سے مستقبل تک یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ آج کے معلوم واقعات کو بھی جانتا ہے اور ان واقعات کو بھی جو کل انسان کے علم میں آئیں گے۔

مثال کے طور پر نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) نے روشنی کے بارہ میں یہ نظریہ قائم کیا کہ یہ چھوٹے چھوٹے روشن ذرات میں جو اپنے منبع سے نکل کر فضا میں اڑتے ہیں۔ اس نظریہ کو سائنس کی تاریخ میں روشنی کا ذرانی نظریہ (Corpuscular theory of light) کہا جاتا ہے۔

A theory of Optics, in which light is treated as a stream of particles.

نیوٹن کے غیر معمولی اثرات کے تحت یہ نظریہ ۱۸۲۰ تک علمی دنیا پر چھایا رہا۔ اس کے بعد اس کو زوال شروع ہوا۔ مختلف سائنس دانوں کی تحقیقات، خاص طور پر فوٹان (Photons) کے عمل کی دریافت نے روشنی کے ذرانی نظریہ کو ختم کر دیا۔ پروفیسر ینگ (اور دوسرے سائنس دانوں) کی تحقیق نے علما کو مطمئن کر دیا کہ روشنی بنیادی طور پر موج کی سی خصوصیات رکھتی ہے جو بظاہر نیوٹن کے ذرانی نظریہ کے برعکس ہے۔

Young's work convinced scientists that light has essential wave characteristics in apparent contradiction to Newton's corpuscular (particle) theory.

Encyclopaedia Britanica, 1984, Vol. 19, P. 665.

نیوٹن نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں اپنا نظریہ پیش کیا اور صرف دو سو سال کے اندر وہ غلط ثابت ہو گیا اس کے برعکس قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں اپنا پیغام دنیا کے سامنے رکھا۔ اور چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس کی صداقت آج تک مشتبہ نہیں ہوئی۔ کیا اس کے بعد بھی اس یقین کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے کہ نیوٹن جیسے لوگوں کا کلام محدود انسانی کلام ہوتا ہے اور قرآن لامحدود ذہن سے نکلا ہوا خدائی کلام ہے۔ قرآن کے بیانات کا ابدی طور پر درست ثابت ہونا ایک انتہائی غیر معمولی صفت ہے جو کسی بھی دوسرے کلام کو حاصل نہیں۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن خدائی کلام ہے اور بقیہ تمام کلام انسانی کلام۔

کائنات کا آغاز

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا (اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: ۳۰)

"رتق" کے معنی ہیں منضم الاجزاء۔ یعنی کسی چیز کے تمام اجزاء کا ایک دوسرے میں گھسا ہوا اور سمٹا ہوا ہونا۔ اور فتق کا لفظ اس کے برعکس عمل کے لیے ہے۔ یعنی ملے ہوئے اجزاء کو پھاڑ کر الگ الگ کر دینا۔

یہ آیت ساتویں صدی عیسوی میں اتری۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کے مختلف اجزا ابتداءً باہم ملے ہوئے اور سمٹے ہوئے تھے۔ اس کے بعد خدا نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا۔ تاہم نزولِ قرآن کے بعد صدیوں تک انسان کو معلوم نہ تھا کہ کائنات میں وہ کون سا معاملہ پیش آیا ہے جس کو قرآن نے رتق اور فتق سے تعبیر کیا ہے۔ پہلی بار اس کی معنویت ۱۹۲۷ میں سامنے آئی جب کہ جارج لیمائٹر (Georges Lemaitre) نے وہ نظریہ پیش کیا جس کو عام طور پر بگ بینگ (Big bang) کہا جاتا ہے۔

یہ جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ چنانچہ موجودہ کائنات کو پھیلتی ہوئی کائنات (Expanding Universe) کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے مختلف مشاہدات نے سائنس دانوں کو اس نظریہ تک پہنچایا ہے کہ کائنات ابتداءً سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔ اس وقت پوری کائنات کے تمام اجزاء نہایت قوت سے باہم جڑے ہوئے تھے۔ اس ابتدائی مادہ کو کائناتی بیضہ (Cosmic egg) یا سپر ایٹم (Super atom) کہا جاتا ہے۔

ابتداء سائنسی حلقہ میں اس کی مخالفت کی گئی۔ ۱۹۴۸ تک بگ بینگ کے مقابلہ میں اسٹنڈی اسٹیٹ نظریہ (Steady-state hypothesis) سائنسدانوں کے یہاں زیادہ قابل توجہ بنا رہا۔ مگر ۱۹۵۰ سے علم کا وزن بگ بینگ کے حق میں بڑھنے لگا۔ ۱۹۶۵ میں بیک گراؤنڈ ریڈیشن (Background radiation) کی دریافت نے اس کی مزید تصدیق کی۔ کیونکہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ ابتدائی انفجار کے ریڈیائی بقایا ہیں جو ابھی تک کائنات کے بعض حصوں میں موجود ہیں۔ اسی طرح ۱۹۸۱ میں بعض کہکشاؤں کی دریافت جو ہماری زمین سے دس ارب سال نور (light years)

کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ وغیرہ۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۹۴) میں بگ بینگ کے عنوان کے تحت اعتراف کیا گیا ہے کہ اور اب اس نظریہ کو بیشتر علماء کونیات کی تائید حاصل ہے:

and it is now favoured by most cosmologists.

یہ واقعہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر میں ماضی سے لیکر مستقبل تک کے تمام حقائق ہیں۔ وہ چیزوں کو وہاں سے دیکھ رہا ہے جہاں سے انسان نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس وقت بھی پوری طرح جان رہا ہوتا ہے جب کہ دوسروں کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

شہد کی طبی اہمیت

قرآن میں شہد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کے اندر شفاء ہے (فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ النحل ۶۹) مسلمانوں نے اس آیت کی روشنی میں شہد کے طبی پہلو پر بہت زور دیا۔ مسلمانوں کے یہاں دواسازی کے فن میں شہد کو خصوصی درجہ حاصل رہا ہے۔ مگر مغربی دنیا صدیوں تک اس کی طبی اہمیت سے بے خبر رہی۔ یورپ میں ابھی انیسویں صدی تک شہد کو بس ایک رقیق غذا (Liquid food) کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ صرف بیسویں صدی کی بات ہے کہ یورپ کے علماء نے یہ دریافت کیا کہ شہد کے اندر دافع عفونت خصوصیات (Antiseptic properties) موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں جدید تحقیقات کا خلاصہ ہم ایک امریکی میگزین سے نقل کرتے ہیں:

Honey is powerful destroyer of germs which produce human diseases. It was not until the twentieth century, however, that this was demonstrated scientifically. Dr. W. G. Sackett, formerly with the Colorado Agricultural College at Fort Collins, attempted to prove that honey was a carrier of disease much like milk. To his surprise, all the disease germs he introduced into pure honey were quickly destroyed. The germ that causes Typhoid fever died in pure honey after 48 hours' exposure. Enteritidis, causing intestinal inflation, lived 48 hours. A hardy germ which causes bronchopheumonia and septicemia held out for four days. Bacillus coli Communis which under certain conditions

causes peritonitis, was dead on the fifth day of experiment. According to Dr. Bodog Beck, there are many other germs equally destructible in honey. The reason for this bactericidal quality in honey, he said, is in its hygroscopic ability. It literally draws every particle of moisture out of germs. Germs, like any other living organism, perish without water. This power to absorb moisture is almost unlimited. Honey will draw moisture from metal, glass, and even stone crocks.

Rosicrucian Digest, September 1975, P. 11
The Rosicrucian Supply Bureau,
Rosicrucian Park, San Joes, California 95191, U.S.A.

شہد جراثیم کو مار ڈالنے والی چیز ہے جو کہ انسانی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ تاہم بیسویں صدی سے پہلے تک اس کو عملی طور پر دکھایا نہیں جا سکا تھا۔ ڈاکٹر ساکٹ جو اس سے پہلے فورٹ کونس کے ایگریکلچرل کالج سے وابستہ تھے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہد کے اندر بیماری کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ مگر ان کو سخت تعجب ہوا جب تجربات کے دوران انہوں نے پایا کہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم جو انہوں نے خاص شہد کے اندر ڈالے تھے وہ سب کے سب بہت جلد مر گئے۔ میعادی بخار کے جراثیم صرف ۴۸ گھنٹے کے اندر ہلاک ہو گئے۔ بعض سخت جان جراثیم بھی چار دن یا پانچ دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ ڈاکٹر بوڈوگ بک نے بتایا ہے کہ شہد کے اندر جراثیم کو مارنے کی اس خصوصیت کی سادہ سی وجہ ہے۔ وہ شہد کی رطوبت کو چوس لینے کی صلاحیت ہے۔ شہد جراثیم کی رطوبت کا ہر جز کھینچ لیتی ہے۔ جراثیم دوسرے حیوانات کی طرح پانی کے بغیر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ شہد کے اندر پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت لامحدود مقدار میں ہے۔ وہ دھات، شیشہ اور پتھر تک سے رطوبت کھینچ لیتی ہے۔

قرآن کی برتری

عربی زبان تمام زبانوں کے درمیان ایک حیران کن استثناء ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک زبان کی عمر پانچ سو سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تقریباً پانچ سو سال میں ایک زبان اتنی زیادہ بدل جاتی ہے کہ اگلی نسل کے لوگوں کے لیے پچھلے لوگوں کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جافرے چاسر (۱۴۰۰ - ۱۳۴۲) اور ولیم شیکسپیئر (۱۶۱۶ - ۱۵۶۴) انگریزی زبان کے شاعر

اور ادیب تھے۔ مگر آج کا ایک عام انگریزی دان ان کو پڑھنا چاہے تو اس کو انہیں ترجمہ کر کے پڑھنا پڑے گا۔ چاسر اور شیکسپیئر کا کلام جدید انگریزی نصاب میں ترجمہ کر کے پڑھایا جاتا ہے، ویسے ہی جیسے غیر زبان کی کتابیں ترجمہ کر کے پڑھائی جاتی ہیں۔

مگر عربی زبان کا معاملہ استثنائی طور پر اس سے مختلف ہے۔ عربی زبان پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے یکساں حالت پر باقی ہے۔ اس کے الفاظ اور اسلوب میں یقیناً ارتقاء ہوا ہے۔ مگر یہ ارتقاء اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنی کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا جائے گا جس طرح چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں وہ بولا اور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سراسر قرآن کا معجزہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے تاکہ جس طرح قرآن کو قیامت تک باقی رہنا ہے اسی طرح عربی زبان بھی زندہ اور قابل فہم حالت میں قیامت تک باقی رہے۔ یہ کتاب کبھی "کلاسیکل لٹریچر" کی الماری میں نہ جانے پائے۔ وہ ہمیشہ لوگوں کے درمیان پڑھی اور سمجھی جاتی رہے۔

یہی معاملہ علوم کا بھی ہے۔ یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے علوم کو پکڑ رکھا ہے۔ وہ علوم کو پکڑ کر بیٹھ گیا ہے تاکہ قرآن نے کسی معاملہ میں جو کچھ کہہ دیا ہے وہی ہمیشہ حرف آخر کی حیثیت سے باقی رہے۔ چنانچہ بے شمار علمی ترقیوں کے باوجود علوم بالآخر وہیں باقی رہتے ہیں یا وہیں لوٹ آتے ہیں جہاں قرآن نے اول دن ان کو رکھ دیا تھا۔

ایک طرف انسانی کلام کی مثال ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ جب کہ قرآن انتہائی بڑے اور گہرے معاملات میں بھی اپنی برتر صداقت کو قائم کیے ہوئے ہے۔ یہاں میں ایک تقابلی مثال دوں گا۔

ارسطو نے اپنے تصوراتی معاشرہ میں عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔ اس کا ثبوت اس کے نزدیک یہ ہے کہ عورت کے منہ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اس کا مذاق اڑایا ہے اس نے اپنی کتاب سماج پر سائنس کے اثرات (The Impact of Science on Society) میں ارسطو کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے :

Aristotie maintained that women have fewer teeth than men;

although he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wives' mouths. (P. 17)

ارسطو نے دعویٰ کیا کہ عورتوں کے یہاں مردوں سے کم دانت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ارسطو کی دو بار شادی ہوئی تھی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اپنی بیویوں کے مُنہ کو جانچ کر اس بیان کی تصدیق کرتا۔

ارسطو کا بیان حقیقت واقعہ پر حاوی نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس قرآن کے بیانات حقیقت واقعہ کا اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہیں کہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں جاتے۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا اس کائنات کا حاکم مطلق ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتا ہے اسے چلاتا ہے (فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ، يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ) پچھلے ہزاروں سال سے خدا کا یہ تصور تسلیم شدہ چلا آرہا تھا۔ انسان اس کو بلا بحث مانے ہوئے تھا۔

مگر موجودہ زمانہ میں علم کی ترقی ہوئی تو انسان نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ واقعات کے پیچھے معلوم مادی اسباب کے سوا اور کوئی قوت نہیں۔ تمام واقعات مادی اسباب و علل کے تحت وقوع میں آتے ہیں۔ اور مادی قوانین کے تحت ان کی کامل توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ مگر بعد کی علمی تحقیقات نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اب علم دوبارہ وہیں آگیا جہاں ابتداء میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

اصولِ تعلیل کی موت

کہا جاتا ہے کہ نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) اپنے باغ میں تھا۔ اس نے سیب کے ایک درخت سے سیب کا پھل گرتے ہوئے دیکھا۔ "سیب کا پھل شاخ سے الگ ہو کر نیچے کیوں گرا، اوپر کیوں نہیں چلا گیا"۔ اُس نے سوچا۔ اس سوال نے آخر کار اس کو یہاں تک پہنچایا کہ زمین میں قوت کشش ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھل درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے، وہ اُوپر کی طرف نہیں جاتا۔

مگر یہ آدھی حقیقت تھی۔ نیوٹن کو سوچنا چاہیئے تھا کہ درخت کا پھل اگر اوپر سے نیچے گرتا ہے تو اسی درخت کا تنہ نیچے سے اوپر کی طرف کیوں جاتا ہے۔ ایک ہی درخت ہے۔ اس کی جڑیں

زمین کے نیچے کی طرف جا رہی ہیں۔ اس کا پھل ٹوٹتا ہے تو وہ گر کر نیچے آجاتا ہے۔ مگر اسی درخت کا تنہ اور اس کی شاخیں زمین سے اٹھ کر اوپر کی طرف چلی جا رہی ہیں۔

درخت کا یہ دوگونہ پہلو نیوٹن کے مفروضہ کی نفی کر رہا تھا۔ تاہم اس نے معاملہ کے ایک پہلو کو چھوڑ کر اس کے دوسرے پہلو کو لے لیا۔ پھر اسی کی روشنی میں اس نے خلا میں پھیلے ہوئے شمسی نظام کے اصول مرتب کیے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام اجرام میں ایک خاص تناسب سے قوت کشش سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو نہایت صحت کے ساتھ متحرک رکھتی ہے۔

یہ طرز فکر مزید آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ آئن سٹائن (۱۹۵۵-۱۸۷۹) نے اپنے نظریہ اضافیت کے تحت اس کو مزید موکد کیا۔ آئن سٹائن کی تحقیق اگرچہ نیوٹن کے تمام نظریات کی تصدیق نہیں کرتی۔ تاہم نظام شمسی کے سلسلے میں اس کے نظریہ کی بنیاد کشش ثقل کے اصول پر ہی قائم ہے:

> Eistein's theory of relativity declares that gravity controls the behaviour of Planets, stars, galaxies and the universe itself and does it in a predictable manner.

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت کہتا ہے کہ کشش ثقل سیاروں، ستاروں، کہکشاؤں اور خود کائنات کے عمل کو کنٹرول کرتی ہے۔ یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

اس سائنسی دریافت کو ہیوم (۱۷۷۶-۱۷۱۱) اور دوسرے مفکرین نے فلسفہ بنایا۔ انہوں نے کہا کہ کائنات کا سارا نظام اصول تعلیل (Principle of causation) پر چل رہا ہے۔ جب تک اسباب وعلل کی کڑیاں معلوم نہیں تھیں انسان یہ سمجھ رہا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والا ایک خدا ہے۔ مگر اب ہم کو اسباب وعلل کے قوانین کا علم ہو گیا ہے۔ اب ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تعلیل (Causation) کا مادی اصول کائنات کو متحرک کرنے والا ہے نہ کہ کوئی مفروضہ خدا۔

مگر بعد کی تحقیقات نے اس مفروضہ کا خاتمہ کر دیا۔ بعد کو ڈیراک، ہیزن برگ اور دوسرے سائنس دانوں نے ایٹم کے ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے پایا کہ ایٹم کا نظام اس اصول کی تردید کر رہا ہے۔ جو شمسی نظام کے مطالعہ کی بنیاد پر اختیار کیا گیا تھا۔

اس دوسرے نظریہ کو کوانٹم نظریہ کہا جاتا ہے اور وہ مذکورہ اصول تعلیل کی کامل تردید ہے:

The quantum mechanics theory maintains that, at the atomic level, matter behaves randomly.

کوانٹم میکینکس کا نظریہ کہتا ہے کہ ایٹمی سطح پر مادہ غیر مرتب انداز میں عمل کرتا ہے۔

سائنس میں کسی "اصول" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عالم میں یکساں طور پر کام کرتا ہو۔ اگر ایک معاملہ بھی ایسا ہو جس پر وہ اصول چسپاں نہ ہوتا ہو تو علمی طور پر اس کا مسلّمہ اصول ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ ایٹم کی سطح پر مادہ اس طرح عمل نہیں کرتا جس کا مشاہدہ نظام شمسی کی سطح پر کیا گیا تھا تو تعلیل بحیثیت سائنسی اصول کے رد ہو گیا۔

آئن سٹائن کو یہ بات ناقابل فہم معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس طرح کائنات مادی کرشمہ کے بجائے ارادی کرشمہ قرار پا رہی تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر باقاعدہ تحقیق شروع کی۔ اپنی زندگی کے آخری ۳۰ سال اس نے اس کوشش میں صرف کر دیے کہ نظام فطرت میں اس "تضاد" کو ختم کرے۔ شمسی نظام اور ایٹمی نظام دونوں کے عمل کو ایک قانون کے تحت منظم کر سکے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ بالآخر ناکام مر گیا:

Einstein spent the last 30 years of his life trying to reconcile these seeming contradictions of nature. He rejected the randomness of quantum mechanics. "I cannot believe that God plays dice with the cosmos," he said.

آئن سٹائن نے اپنی آخری زندگی کے ۳۰ سال اس پر صرف کیے کہ فطرت کے اس بظاہر متضاد اصول کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرے۔ اس نے کوانٹم نظریہ کی بے ترتیبی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ خدا کائنات کے ساتھ جوا کھیل رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بیان کائنات کو پکڑے ہوئے ہے۔ شمسی نظام کی سطح پر حرکت کا مطالعہ کر کے انسان نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہ رائے قائم کر لی کہ اس کی حرکت معلوم مادی اسباب کے تحت ہو رہی ہے۔ یہ بااختیار خدا کے قرآنی تصور کی گویا تردید تھی۔ مگر علم کا دریا جب آگے بڑھا تو دوبارہ قرآن والی بات غالب آگئی۔ بیسویں صدی میں ایٹمی نظام کے مطالعہ نے بتایا کہ ایٹم کی سطح پر اس کے ذرات کی حرکت کا کوئی معلوم قاعدہ نہیں۔

ایک سائنسدان اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

The laws of physics discovered on earth contain arbitrary

numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? (Ian Roxburg)

طبیعیات کے قوانین جو زمین پر دریافت کیے گئے ہیں وہ تحکمی گنتیوں پر مشتمل ہیں، جیسے الیکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ کیوں۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انہیں گنتیوں کا انتخاب کر رکھا ہے (سنڈے ٹائمس، لندن، ۴ دسمبر ۱۹۷۷)۔

یہ الفاظ سائنس کی زبان سے اس بات کا اعتراف ہیں کہ کائنات انسانی علم کے احاطہ میں نہیں آتی۔ کائنات ایک قادر مطلق خدا کی مرضی کا ظہور ہے۔ اور خدا کی مرضی کے تصور کے تحت ہی اس کی واقعی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔

مولانا وحید الدین خان (انڈیا) نے مندرجہ بالا مقالہ ۲۶ مارچ ۸۵ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام محاضرات قرآنی میں پیش فرمایا۔

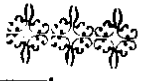

وقت کے اہم، نازک اور زیر بحث موضوع
اسلام میں عورت کا مقام
پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کا مدلل و مفصل خطاب
کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
جس میں اس خطاب کے علاوہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تالیف "نقوش اقبال" سے ماخوذ
عورت اقبال کی نگاہ میں
عمدہ آفسٹ پیپر۔ اعلیٰ طباعت۔ صفحات ۱۲۰
ملنے کا پتہ

سیرت نبوی کے ضمن میں دو عظیم تحفے
ڈاکٹر اسرار احمد
صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کی تقاریر کے دو مجموعے — اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ
رسول کامل
یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور
فرائض دینی اور اسوۂ رسول
سورۂ احزاب رکوع ۳،۲ کی روشنی میں

حضرت سیّد احمد شہیدؒ کا مقصدِ حیات

(مولانا سید نفیس الحسینی)

امام المجاہدین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مقصدِ حیات صرف اور صرف اعلاءِ کلمۃ الحق اور نصرتِ دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام تھا۔ اُن کی تمام تر زندگی کا یہی نصب العین تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ اسی کی ایک شاخ ہے۔ اور حکومت اسلامی کا قیام بھی اسی کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی مقصد کی خاطر انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں، سختیاں برداشت کیں۔ اسی دُھن میں انہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا، عزیز و اقارب سے دُوری اختیار کی۔ وطن مالوف ہندوستان سے ہجرت فرمائی۔ اور سندھ کے ریگزاروں، چٹیل میدانوں سے گذر کر صوبہ سرحد کی سنگلاخ سرزمین کو اپنا مرکزِ جہاد بنایا۔ اسی مقصدِ وحید کی خاطر انہوں نے اس علاقہ میں سب سے پہلی اسلامی حکومت قائم کی اور بالآخر یہی جذبۂ صادق انہیں بالاکوٹ کی شہادت گاہ میں لے گیا اور انہوں نے اپنی اور اپنے نیک نہاد رفقاء کی جانوں کے نذرانے بارگاہِ رب العزت میں پیش کر کے سرخروئی حاصل کی۔

بناکردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت سید احمد شہید کے سیرت نگار مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں،

"اس معرکے میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالمِ انسانیت کے رونق و زینت اور مسلمانوں کے لیے شرف و عزت اور خیر و برکت کا باعث تھے۔ مردانگی و جوانمردی، پاکیزگی و پاکبازی، تقدس و تقویٰ، اتباعِ سنت و شریعت اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر، جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور انسانیت اور اسلام کے باغ کا جیسا "عطرِ مجموعہ" صدیوں

سے تیار نہیں ہوا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ۲۴/ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا۔ مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔ حکومت شرعی ایک عرصہ کے لیے خواب بے تعبیر ہو گئی۔ بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنج شہیداں سے گلزار بنی جس کے اخلاص وللہیت، جس کی بلند ہمتی واستقامت، جس کی" جرأت وہمت اور جس کے جذبۂ جہاد وشوقِ شہادت کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔"

اب میں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب سے چند اقتباس پیش کرونگا جن سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت برصغیر پاک وہند میں انگریزی تسلط واستعمار کو ختم کرنے اور اسلامی غلبہ واقتدار واپس لانے کے لیے میدان جہاد میں اُتری اور اپنی بساط سے بڑھ کر اس نے جدوجہد کی۔ حضرت سید صاحب شہید کا نصب العین تو اس سے بھی وسیع تر تھا۔ وہ تمام اسلامی قوتوں کو ایک مرکز پر لاکر کفر وطغیان کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔

علماء ومشائخ ہندوستان کے نام ایک مکتوب میں حضرت سید صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

"ہر چند یہ فقیر زمانۂ سابق میں بھی خدا کے فضل سے نیک کام یعنی لوگوں کو اتباع شریعت کی طرف دعوت دینے میں دن رات کوشش وجانفشانی میں مشغول تھا چنانچہ یہ بات اس فقیر کے اکثر احباب پر روشن ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اس فقیر کو چند مخلص مومنین کے ساتھ مہاجرین صادقین کے زمرہ میں داخل فرمایا۔ خدا کا اس احسان پر شکر ہے لیکن چونکہ زبانی دعوت وتبلیغ بغیر شمشیر وسنان سے جہاد کر کے مکمل نہیں ہوتی اسی لیے رہنماؤں کے پیشوا اور مبلغوں کے سردار حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں کفار سے جنگ کرنے کے لیے مامور ہوئے اور دینی شعائر کی عزت اور شریعت کی سربلندی وترقی اسی رُکن جہاد کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی۔ اسی بناء پر اس عبادتِ عُظمیٰ کی ادائی اور سعادت عالیہ کے حصول کا عزم اس طرح فقیر پر القا کیا گیا ہے کہ اس عظیم المرتبت کام کے انجام دینے میں جان ومال قربان کر دینا، اہل وعیال

اَور برادری کو خیرباد کہنا اَور وطن سے ہجرت کر جانا، ناپاک مکھیوں کو ہانکنے اَور خس و خاشاک دُور کرنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا اَور یہ سب کچھ محض اللہ کے لیے ہے۔ اس جذبۂ الٰہیہ میں نفسانی خواہشات اَور شیطانی وسوسہ کا شائبہ بھی نہیں"۔

"ہم لوگ خدا کے بندے اَور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ہونے کیوجہ سے اسلام کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اَور اپنے کو پیروانِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شمار کرتے ہیں۔ جبکہ ہم نے اس بات یعنی جہاد پر کلام الٰہی کو ناطق مان لیا ہے اَور نبی کریمؐ کو سچا جانتے ہیں۔ لامحالہ ہم نے اللہ اور اُس کے حکم کی بجا آوری کے لیے کمر ہمت باندھ لی ہے۔ اور اُسوۂ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں سفر کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ممالک ہندوسندھ و خراسان دُور دُور کی سیاحت کی ہے۔ جس کا مقصد کُلی صرف "طلب خیر" ہے۔

آخر کار ان دُور دراز ممالک میں پھر کر پہاڑوں اَور تمام دشت و بیابان کو طے کر کے یوسف زئیوں کے مُلک پہنچے ہیں۔ ہم نے اس سعادتِ عظمیٰ جہاد کے لیے ان کو بھی آمادہ کر لیا ہے۔ غرضیکہ جب تک ہمارے جسم میں جان ہے اور ہمارے سر جسموں کے ساتھ ہیں ہم اِسی سودے میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اپنے مالک کی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

نواب سلیمان جاہ، وائی کا شعر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔،

"تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ "نصاریٰ نکو رسیدہ خصال اَور مشرکین بدمآل" نے ہندوستان کے اکثر حصّہ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اَور ظلم و بیداد شروع کر دیا۔ کفر و شرک کی رسوم کا غلبہ ہو گیا اَور شعائر اسلام اٹھ گئے یہ حال دیکھ کر دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ ہجرت کا شوق دامنگیر ہوا۔ دِل میں غیرتِ ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے"۔

شاہ محمود دُرّانی وائی ہرات لکھتے ہیں۔

"جہاد قائم کرنا اَور بغاوت و فساد کو مٹانا ہر زمانے اَور ہر مقام میں خدا کا نہایت

اہم حکم رہا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کافروں اور سرکشوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے کہ سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھوں دینی شعائر بگاڑے جا رہے ہیں اور شاہانِ اسلام کی حکومتوں میں ابتری پیدا کی جا رہی ہے اور یہ زبردست فتنۂ ہند، سندھ اور خراسان کے خطوں پر چھا گیا ہے۔ اس صورت میں سرکش کافروں کی بیخ کنی سے غفلت اور مفسد باغیوں کی گوشمالی سے سہل انگاری، بہت بڑا اور بہت قبیح گناہ ہے۔ اس بنا پر خدا کی درگاہ کے اس بندے نے اپنے وطن سے نکل کر ہند و سندھ و خراسان کا دورہ کیا اور وہاں کے مومنوں اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی۔"

الیٔ ہرات کو مزید لکھتے ہیں:-

جہاد ضروری ہے۔ جب ہندوستان اہلِ کفر و طغیان کے اثرات سے لبریز ہو گیا تو میں نے وطن چھوڑ کر خراسان کا رُخ کیا۔ سب کو جہاد کی دعوت دیتا رہا۔ یوسف زئی کے علاقے میں آیا تو آفریدی، خٹک، مہمند، خلیل، اہلِ ننگرہار، اہلِ سوات و بنیر، اہلِ پکھلی اور راجہ ہائے کشمیر وغیرہ میرے ساتھ ہو گئے ہیں۔ میرا مقصد حکومت نہیں صرف کلمۂ حق کی سربلندی اور سنتِ نبویؐ کا احیاء ہے۔ نیز میں اسلامی علاقوں کو سرکش کافروں کے ہاتھ سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ جب یہ علاقے مشرکوں اور منافقوں کے تسلط سے پاک ہو جائیں گے تو انہیں مستحقوں کے حوالے کر دوں گا بشرطیکہ خدا کے اس انعام کا شکر بجا لائیں۔ ہمیشہ ہر حالت میں جہاد قائم رکھیں، کبھی اسے معطل نہ چھوڑیں، عدالت اور فیصلۂ مقدمات میں شرع کے قانون سے بال برابر بھی تجاوز نہ کریں۔ ظلم و فسق سے بالکل بچے رہیں۔"

مکتوب کے آخر میں فرماتے ہیں:-

"پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تاکہ وہاں سے اہلِ کفر و طغیان (یعنی انگریزوں) کو ختم کیا جا سکے۔ اور میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے۔ یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کر لوں۔"

مؤرخِ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک احیائے دین پر یوں روشنی

ڈالتے ہیں:

"تیرھویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم و بدعات کا زور تھا حضرت سید احمد شہید بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دو بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لیکر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی۔ اور لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے اس مجاہدانہ کارنامے کی عام تاریخ لوگوں کو یہیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار ہو کر سکھوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہو گئے حالانکہ یہ واقعہ اس پوری تاریخ کا صرف ایک باب ہے۔ ان مجاہدوں کی تاریخ بتائیگی کہ ان کی تحریک کا یہ ناکام انجام کیوں ہوا۔ واقعہ ڈھکا چھپا نہیں اور اسباب نامعلوم نہیں۔ وہی جماعتوں کا نفاق اور امراء کا اختلاف ان کی ناکامی کا سبب ہوا۔ جو ہمیشہ سے ناکاموں کی ناکامی کا باعث بنتا رہا۔ پشاور کے امراء اگر وفاداری سے کام لیتے تو آج برصغیر پاک و ہند کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔"

آخر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک بصیرت افروز تحریر "شہداء بالاکوٹ کا مقام و پیام" کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ خطاب عام ہے لیکن اس کے مخاطب اوّل اہل پاکستان ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک مخلص بندے کے ہاتھ پر اپنے مالک سے اس کی رضا، اُس کے نام کی بلندی اور اُس کے دین کی فتح مندی کے لیے آخری سانس تک کوشش کرنے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ مٹا دینے کا عہد کیا تھا۔ جب تک اُن کے دم میں دم رہا، اُسی راہ میں سرگرم رہے۔ بالآخر اپنے خونِ شہادت سے اس پیمانِ وفا پر آخری مہر لگا دی۔ وہ خلعتِ شہادت

پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے، وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ، نہ شکست و ناکامی پر عتاب ہے، نہ کسی سلطنت کے عدم قیام پر محاسبہ وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں، صدق و اخلاص اور اپنی مساعی اور وسائل کا پورا استعمال۔ اس لحاظ سے شہداء بالاکوٹ اس دنیا میں بھی سُرخرو ہیں اور ان شاء اللہ دربارِ الٰہی میں بھی باآبرو کہ انہوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے مالک کی رضا کے لیے اپنی مساعی اور وسائل کے استعمال میں ذرہ برابر کمی نہیں کی۔

یوں تو شہداء بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا یہ پیغام ہے کہ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ

مگر گوشِ شنوا اور دیدۂ بینا کے لیے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لیے کوشش و جہد کرتے رہے جہاں ہم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔ جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت و عظمت کا قائل کر سکیں۔ جہاں نفس و شیطان، حاکم و سلطان اور رسم و رواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت و اطاعت ہو۔ تقدیرِ الٰہی نے ہمارے لیے اس سعادت و مسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں میدان جنگ کی شہادت اور قربِ رضا کی دولت کو ترجیح دی۔ ہم اپنے رب کے اس فیصلے پر رضامند و خورسند ہیں۔ اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصّہ میں کوئی ایسا خطۂ زمین عطا فرمایا جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکو اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو اور ان شرائط و اوصاف کا ثبوت نہ دو جو مہاجرین و مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں تو تم ایسے کفرانِ نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہو گے جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

ہم نے جس زمین کے چپے چپے کے لیے جد و جہد کی اور اس کو اپنے خون سے رنگین کر دیا اکوڑے اور شیدو کے میدان اور تورو اور مایار کی رزمگاہ سے لیکر

بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خونِ شہادت کی مُہریں اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں۔ تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبے اور سرسبز و شاداب خطّے سپرد فرمائے اور بعض اوقات قلم کی ایک جُنبش اور برائے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔ اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ و اقتدار کے حصول اور حقیر و فانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین، ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون جاری نہ کیا اور تمہارے ملک اور تمہاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون و سیاست اور تمہارے حاکم اپنے اخلاق و سیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے، تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے جن سے تم نے مسلمانوں کے لیے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کا ذرہ ذرہ حساب دینا پڑیگا، کیا جواب دو گے؟ خدا نے تم کو ایک ایسا نادر و زرّیں موقع عطا فرمایا ہے، جس کے انتظار میں چرخِ کہن نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں اور تاریخ اسلام نے ہزاروں صفحے اُلٹے، جس کی حسرت و آرزو میں خدا کے لاکھوں پاک نفس اور عالی ہمت بندے دنیا سے چلے گئے۔ اس موقع کو اگر تم نے ضائع کر دیا تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہوگا۔ بالاکوٹ کے ان شہیدوں کا جو ایک دُور افتادہ بستی کے ایک گوشے میں آسودۂ خاک ہیں۔ اُن سب لوگوں کے لیے جو اقتدار و اختیار کی نعمت سے سرفراز اور ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے ہیں، پیغام ہے کہ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (کیا یہ احتمال بھی ہے کہ اگر تمہاری حکومت ہو تو تم زمین میں فساد کرو اور قطع رحمی سے کام لو۔"

ہدایت القرآن

مولانا محمد تقی امینی

سورۂ فاتحہ مکّی ہے[1]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے[2]

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۳﴾

"اللہ ہی ہر تعریف کے لائق ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے رحمٰن اور رحیم ہے۔ جزا کے دن کا مالک ہے[3]"

---

[1] قرآن اللہ کی کتاب ہے اسی نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اس کو اتارا ہے دنیوی زندگی کے جن گوشوں میں اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے بغیر چارہ نہ تھا یہ کتاب ان تمام گوشوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس میں ۱۱۴ سورتیں ہیں جس طرح ہماری کتابیں ابواب میں تقسیم ہوتی ہیں اللہ کی کتاب سورتوں میں تقسیم ہے۔ سورۃ کے لفظی معنی بلندی کے ہیں۔ اس لحاظ سے ہر سورۃ انسان کو بلند مقام کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

ان سورتوں میں بعض مکّی ہیں اور بعض مدنی ہیں۔ ہجرت سے پہلے جو سورتیں یا ان کا بیشتر حصہ نازل ہوا ان کو مکی سورتوں میں شمار کیا گیا۔ اور ہجرت کے بعد جو سورتیں یا ان کا بیشتر حصہ نازل ہوا ان کو مدنی سورتوں میں شمار کیا گیا ہے۔

مکّی اور مدنی کی یہ تقسیم جگہ کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ حالات کے لحاظ سے ہے یعنی ہجرت سے پہلے کی دعوت پیش کرنے کے جو حالات تھے اور ان کے لحاظ سے جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں وہ مکی کہلاتی ہیں اگرچہ خاص مکہ میں نازل ہوئی ہوں، اور ہجرت کے بعد (قرآن) کی دعوت پیش کرنے کے جو حالات تھے اور ان کے لحاظ سے جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں وہ مدنی کہلاتی

ہیں اگرچہ خاص مدینہ میں نہ نازل ہوئی ہوں۔

مکی اور مدنی تقسیم سے دعوتی طریق کار کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ جس طرح کسی جماعت کو کسی اہم کام کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے تو اس کی حالت ضرورت اور استعداد کو ملحوظ رکھ کر ہدایتیں اور حکم و احکام کا سلسلہ جاری کیا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے پیش نظر ابتداءً ایک ایسی جماعت تیار کرنی تھی جو ساری دنیا کی رہنمائی کے لیے نمونہ کا کام دے سکے۔ اس کی حالت ضرورت اور استعداد کو ملحوظ رکھ کر ایک خاص ترتیب کے ساتھ آیتوں اور سورتوں کے اتارنے کا سلسلہ جاری کیا گیا تھا۔ اس ترتیب کو تاریخ نزول و شانِ نزول کے علم کے ذریعہ ضروری حد تک محفوظ رکھا گیا ہے۔

لیکن قرآن کا انداز بیان صرف دعوت و خطابت کا نہیں ہے بلکہ ضابطۂ حیات اور زندگی کے لیے دستور العمل کا بھی ہے اس بنا پر لازمی طور سے ایک اور ترتیب ہونی چاہیئے جو دعوتی ترتیب سے یقیناً مختلف ہوگی اور یہ ترتیب پہلی کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور زیادہ توجہ طلب ہوگی کہ اسی کو کتاب ہدایت کی شکل میں تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے باقی رکھنا تھا پھر اس ترتیب میں نظم و ضبط اور باہمی ربط و تعلق کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ غیر منظم و غیر مربوط کلام سے ضابطۂ حیات اور دستور العمل کی ٹھیک طرح وہ ضرورت نہ پوری ہو سکے گی جو قرآن کا مقصود و مطلوب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ترتیب کی طرف خصوصی توجہ فرماتے تھے اور جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوتیں اللہ کی ہدایت کے مطابق آپ خود ان کی مناسب جگہ تجویز فرما کر وحی کے لکھنے والوں کو حکم دیتے تھے کہ فلاں آیتوں کو فلاں آیتوں کے بعد اور فلاں سورتوں کو فلاں سورتوں کے بعد لکھا جائے اب جس ترتیب کے ساتھ قرآن موجود و محفوظ ہے یہ وہی ترتیب ہے جو اللہ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی ہے اور جس میں اس کے ضابطۂ حیات اور دستور العمل ہونے کی زیادہ رعایت ہے۔ اس ترتیب میں اکثر وہ سورتیں پہلے ہیں جو بعد میں نازل ہوئی ہیں اور جو بعد میں ہیں وہ پہلے نازل ہوئی ہیں۔ آخری پاروں کی بیشتر سورتیں مکی ہیں جو پہلے نازل ہوئی ہیں لیکن وہ آخر میں رکھی گئی ہیں اور انہیں پر کتاب ختم ہو رہی ہے سورۂ بقرہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے لیکن اس کو سورۂ فاتحہ کے بعد رکھا جو مکی ہے اور اسی سے کتاب الٰہی کا دوسرا سبق شروع ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن کی دو ترتیبیں ہیں۔

(۱) نزولی ترتیب جس میں حالت، ضرورت اور استعداد کی رعایت کی گئی ہے مکی اور مدنی تقسیم

سے اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور تاریخ نزول وشانِ نزول کے علم سے اس کا پتہ لگایا جاتا ہے۔
(۲) کتابی ترتیب جس کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی ہدایت کے مطابق کتابی شکل میں ترتیب دی ہے جس میں ضابطۂ حیات اور دستور العمل کی رعایت کی گئی ہے اس کے غیر منظّم اور غیر مربوط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ترتیب کتاب الٰہی کی ترتیب ہے کسی بندے کی لکھی ہوئی کتاب کی ترتیب نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کو کسی اور کتاب پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

۲؎ اللہ اور بندے کے درمیان جیسا تعلق ہے اس کے لحاظ سے ہر کام کی ابتداء اللہ کے نام سے ہونی چاہیئے کہ وہی بندوں پر سب سے زیادہ مہربان ہے اور اسی کی مدد کا سب سے زیادہ سہارا ہے۔

۳؎ سورۂ فاتحہ کتابِ الٰہی کا پہلا سبق ہے۔ فاتحہ اس کو کہتے ہیں جس سے کوئی شئے شروع کی جائے اس سے قرآن شروع کیا گیا ہے۔ اس لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام فاتحۃ الکتاب رکھا ہے۔ اسی کا مختصر نام فاتحہ ہے۔

سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہؐ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ پھر اللہ سے بندوں کا تعلق بتایا گیا ہے۔ اللہؐ کے تعارف میں جس پر سب سے زیادہ زور ہے وہ یہ ہے کہ اللہ خوف ودہشت کی طاقت نہیں ہے کہ جس سے بھاگا جائے بلکہ محبت ورحمت کا پیام ہے کہ اس کی طرف دوڑا جائے۔ چنانچہ پہلے ہی اللہ کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں (۱) پروردگاری (۲) رحم وکرم اور (۳) عدل وانصاف۔

ان تینوں صفتوں کے ذریعہ انسان ہی کی نہیں کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی پرورش۔ حفاظت۔ نگرانی اور ترقی کا سروسامان ہوتا ہے۔ ابتداء لفظ حمد سے کی گئی ہے جس کے معنی تعریف کے ہیں، کسی کی تعریف اس کی خوبیوں کی بناء پر ہوتی ہے اللہ نہ صرف ہر قسم کی خوبیوں سے آراستہ ہے بلکہ سارے جہان میں جس قدر خوبیاں ہیں وہ اسی کی عطا کی ہوئی ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر تعریف کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے؟

(۱) پروردگاری یہ ہے کہ ہر ایک کی پرورش، حفاظت، نگرانی اور ترقی کا سلسلہ آخری حد اور آخری دم تک جاری رہے جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو اور جیسی حفاظت ونگرانی درکار ہو اس کے لحاظ سے پورا پورا بندوبست ہو اور کسی گوشہ میں کسی وقت کسی چیز کی کمی نہ پائی جائے۔

(۲) رحم وکرم یہ ہے کہ ہر وقت زوروں کے ساتھ اس کی رحمت کی بارش ہوتی رہے اس کے لیے رحمٰن اور رحیم دو لفظ لائے گئے ہیں اور دونوں رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں رحمٰن رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کرتا ہے اور رحیم رحمت کی پائداری و ہمیشگی کو ظاہر کرتا ہے یعنی اللہ کی رحمت ہر وقت جوش میں رہتی ہے وہ وقتی و عارضی نہیں ہوتی ہے بلکہ ہمیشہ پائداری کے ساتھ جاری رہتی ہے۔

عدل وانصاف یہ ہے کہ وہ اچھے بُرے کاموں کا بدلہ دیتا ہے۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (وہ بدلہ کے دن کا مالک ہے) میں دین کے معنی بدلہ ہیں جو نیکی کی جزا اور برائی کی سزا دونوں کو شامل ہے۔ اللہ بادشاہوں کی طرح نہیں ہے کہ وہ خوش ہوئے تو آسمان پر بٹھا دیا ناخوش ہوئے تو سولی پر لٹکا دیا۔ بلکہ انسان کی اچھائی برائی کمائی جیسی ہوتی ہے اس کے لحاظ سے اچھا برا بدلہ دیتا ہے۔ عدل وانصاف اس کی رحمت کے خلاف نہیں ہے بلکہ رحمت ہی کا تقاضا ہے۔ کہ ظالم و مظلوم کار آمد و ناکارہ اور بھلائی و برائی کو یکساں نہ رکھا جائے بلکہ ضروری ہے کہ مظلوم کی دادرسی کی جائے، ظالم کی پکڑ ہو، کار آمد کو باقی رکھا جائے، ناکارہ کو ہٹا دیا جائے، بھلائی کو قوت پہنچائی جائے اور برائی کو کمزور کیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہو بلکہ ظالم و مظلوم، کار آمد و ناکارہ اور بھلائی و برائی کو یکساں رکھا گیا تو رحمت زحمت میں تبدیل ہو جائے گی اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

اے اللہ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

بندوں کا اللہ کے ساتھ تعلق میں جس پر سب سے زیادہ زور ہے وہ یہ ہے کہ بندہ ہر حال میں اور ہر لحاظ سے اس کا بندہ ہے وہی اس کی تمام ضرورتوں کو پوری کرتا ہے وہی ہر موقع پر اس کی مدد کرتا ہے اور وہی صرف وہی اس کا مستحق ہے کہ عجز و نیازمندی کی گردن اس کے سامنے جھکے اس میں نہ کسی اور کی شرکت ہو اور نہ اسکے ساتھ جلالی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

اللہ کے ساتھ شرکت کسی درجہ میں بھی گوارا نہیں ہے اگر شرکت گوارا ہوتی تو اس کے لیے سب سے زیادہ لائق وہ ذاتِ اقدس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تھی جو انسانوں میں سب سے زیادہ افضل اور پیغمبروں میں سب سے زیادہ برتر ہے لیکن جس مضبوطی اور تاکید کے ساتھ آپکی شرکت سے انکار کیا گیا ہے اس کے بعد کسی بزرگ، ولی اور دیوی دیوتا کی شرکت کا دور دورہ بھی ختم ہو جاتا ہے،

چنانچہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا بنیادی کلمہ یہ ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اقرار کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں"۔

اس کلمہ میں جس طرح اللہ کی توحید کا اقرار ہے ٹھیک اسی طرح رسول اللہؐ کے بندہ ہونے اور رسولؐ ہونے کا اقرار ہے جو بندہ ہوگا وہ آقا کا شریک نہیں ہوسکتا جو رسول ہوگا وہ اوتار نہیں ہوسکتا۔ کوئی شخص اسلام میں اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک رسول اللہؐ کے بندہ ہونے کا اقرار نہ کرے اور "اوتار" ہونے سے انکار نہ کرے۔ اللہ کا رسولؐ ہر حال میں رسولؐ اور بندہ رہتا ہے نہ کبھی اللہ کے اختیارات لے کر وہ آتا ہے اور نہ کبھی اللہ اس کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اللہ کے ساتھ چالاکی یہ ہے کہ زبان سے تعلق کا اظہار ہو اور عمل میں اس کی خاطر اپنے فائدہ اور ذاتی غرض کی قربانی دینے کے لیے تیاری نہ ہو۔ جب تک اپنے فائدہ اور ذاتی غرض سے ٹکراؤ نہ ہو اللہ سے تعلق نہایت جوش و خروش کے ساتھ ظاہر کیا جائے اور جہاں اس کی خاطر کسی فائدہ کو چھوڑنے اور ذاتی غرض قربان کرنے کا وقت آجائے بس وہیں اس تعلق کو خیرباد کہہ کر فائدہ حاصل کرلیا جائے اور غرض پوری کرلی جائے۔

عبادت کے معنیٰ لغت میں اللہ کی عظمت و بڑائی کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی و ذلت ظاہر کرنا اَلعِبَادَۃُ غَایَۃُ الذُّلِّ (المفردات) چنانچہ کلام عرب میں طَرِیْقٌ مُعَبَّدٌ اس راستہ کو کہا جاتا ہے جو پاؤں سے خوب روندا گیا ہو، لیکن قرآن میں جس عبادت کا حکم ہے اور بندہ مذکورہ آیت میں جس عبادت کا اقرار کرتا ہے اس سے مراد وہ عبادت ہے جس میں اللہ کی عظمت و بڑائی کے سامنے انتہائی عاجزی و ذلت کا اظہار انتہائی محبت و دل کی لگن کے ساتھ ہو۔ اللہ بندہ کا صرف آقا و حاکم نہیں ہے بلکہ محبوب و من موہن (دل کا پیارا) بھی ہے قرآن میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ — جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے

(البقرہ: ۱۶۵) — زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اس بناء پر جو عبادت محبت کے بغیر ہوگی اس میں صرف ضابطہ (قانون) کی خانہ پری ہوگی اور دل و جان سے اللہ کی وفاداری نہ ہوگی اس میں قانون کی خشکی ہوگی اور محبت کی چاشنی

سے محروم ہو گی جبکہ اللہ کو مطلوب وہ عبادت ہے جس میں محبت کی چاشنی بھی ہو۔

عبادت کے دائرہ میں بڑی وسعت ہے ہر وہ کام اور بات عبادت ہے جس سے اللہ راضی ہو اور جو اللہ کو پسندیدہ ہو۔ مثلاً سچائی، امانت، دیانت، رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک، ماں باپ کی فرماں برداری، شوہر، بیوی اور اولاد کے حقوق کی ادائیگی عہد اور قول و قرار کی پابندی۔ اچھی باتوں کی طرف رغبت دلانا اور بُری باتوں سے روکنا۔۔۔۔ ظلم و فساد کے خلاف جہاد، یتیموں مسکینوں اور ماتحتوں کے ساتھ بہتر سلوک، دعا، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن، اللہ و رسولؐ سے محبت، رحمتِ الٰہی کی اُمید، عذابِ الٰہی سے خوف، اخلاص، صبر، شکر، توکل، اللہ کے فیصلے پر رضامندی اور تمام وہ باتیں اور کام عبادت کے دائرہ میں ہیں جو اپنی ذات کے لیے، گھر والوں کے لیے، عزیزداروں، رشتہ داروں کے لیے اور اللہ کے دوسرے تمام بندوں کے لیے نفع پہنچانے والے ہوں یا نقصان سے بچانے والے ہوں۔

اسی لحاظ سے لغت میں عبادت کے معنی اطاعت و فرماں برداری کے بھی آتے ہیں کہ زندگی کے تمام حالات و معاملات میں بندہ اللہ اور صرف اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کرے العبادۃ الطاعۃ (لسان العرب) ایسا نہ ہو کہ رکوع میں عجز و نیازمندی کی گردن اللہ کے سامنے جھکے، سجدہ میں اس کی عظمت و بڑائی کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی و ذلت ظاہر کرے اور زندگی کے دوسرے حالات و معاملات میں خودسر ہو جائے یا کسی اور کی ایسی فرماں برداری کرے جو اللہ کی فرماں برداری سے ٹکراتی ہو۔ بندہ ہر حال میں اللہ کا بندہ ہے خواہ مسجد و گھر میں ہو محلہ و بازار میں ہو۔ افسر کی ماتحتی میں ہو یا حکومت کی کرسی پر ہو۔

عبادت کے اس وسیع دائرہ کا ثبوت قرآن میں بھی ہے چنانچہ ہر پیغمبرؑ نے اپنی قوم سے یہ کہا کہ:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (نحل: ۳۶)	کہ تم اللہ کی بندگی کرو۔

دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ (یٰسین: ۶۰)	اے اولادِ آدمؑ کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

دونوں موقعوں پر عبادت کا دائرہ اطاعت وفرماں برداری کی ہر قسم اور ہر شکل کو سمیٹے ہوئے ہے جو ذات عبادت کی حق دار ہے وہی ہر حال اور ہر معاملہ میں اطاعت کی بھی حق دار ہے، عبادت کسی اور کی ہو اطاعت وفرماں برداری کسی اور کی ہو یہ نہایت بے تکی بات ہے جس کو کرنی بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔

لیکن عبادت کے اس مجموعہ میں چند شکلیں ایسی ہیں جن کی حیثیت عبادت کے اجزاء میں وہی ہے جو حیثیت جسم کے اعضاء میں قلب ودماغ کی ہے اس لیے عبادت کے وسیع دائرہ میں ان کو خاص اہمیت دی گئی اور ان پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی، وہ یہ ہیں۔

(۱) کلمۂ شہادت کا دل وجان سے اقرار (۲) نماز (۳) زکوٰۃ (۴) روزہ اور (۵) حج۔ جس طرح نکاح کے وقت ایجاب وقبول نکاح کے بعد کے تقاضوں اور مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے ایک عہد اور اہم فیصلہ ہے، اسی طرح کلمۂ شہادت بھی ایک اہم فیصلہ اور عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت (اپنے وسیع دائرہ میں) کریں گے۔ اور زندگی کے ہر حال ومعاملہ میں اس کی بھیجی ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایتوں پر عمل کریں گے۔ اس اہم فیصلہ وعہد کی علامت ونشانی کے طور پر نماز روزہ زکوٰۃ اور حج (چار ارکان) مقرر کیے گئے ہیں ان کی حیثیت گویا ٹریننگ (تربیتی) کورس کی ہے کہ جو شخص ٹھیک ٹھیک اپنے وقت پر یہ ارکان ادا کرتا رہے گا اس کی پوری زندگی عبادت کے سانچہ میں ڈھلتی اور اللہ کی فرمانبرداری کرتی رہے گی۔

(باقی آئندہ)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قرآن اکیڈمی میں قرآن کی بہار

مرتب: شیخ رحیم الدین

" ماہِ رمضان المبارک کو جو دوسرے تمام مہینوں پر فضیلت حاصل ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اس میں قرآنِ حکیم نازل ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ؕ اور اس مبارک مہینے کی راتوں میں قیام اللیل یا تراویح کا جو نظام قائم ہے یہ دراصل قرآن حکیم کے ساتھ تجدیدِ تعلق کا ایک پروگرام ہے۔ بخاری و مسلم کی متفقہ روایت ہے:

من صام رمضان ایمانا و	جس نے روزے رکھے رمضان میں
احتسابا غفر لہ ما تقدم	ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے
من ذنبہ و من قام رمضان	گئے اس کے تمام سابقہ گناہ۔ اور جس
ایمانا و احتسابا غفر لہ	نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں
ما تقدم من ذنبہ	ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے

گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ ___

اس حدیث شریف کے پہلے حصہ پر تو عامۃ المسلمین عمل کرنے کی سعی و کوشش کرتے ہیں اور اس کے مناظر معاشرہ میں نظر بھی آنے لگتے ہیں۔ مگر اس حدیث کے دوسرے حصہ پر عمل قریباً متروک ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اگر ہے بھی تو محض جزوی یعنی رمضان کے دوران روزانہ پوری پوری رات قرآن کے ساتھ بسر کرنے کا تو کوئی تصور بھی اس دور میں لوگوں کے ذہنوں میں نہیں رہا تاہم قانونی کارروائی کی حد تک کہ پورے رمضان میں ایک بار قرآن حکیم تراویح میں سن لینے کا کسی قدر اہتمام کیا جاتا ہے اور پھر اس میں بھی اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ تراویح کم سے کم وقت میں ختم ہو جائیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حافظ صاحبان کو قرأت بھی تیزی سے کرنی پڑتی ہے۔ اور اکثر و بیشتر مقتدی حضرات تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن سے قطعاً بے خبر اور لاتعلق رہتے ہیں۔

قرآن حکیم کو کس طرح پڑھا جائے! اس کے متعلق وہ خود حکم دیتا ہے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ

تَرْتِیْلًا ۝ یعنی قرآن کی تلاوت واضح اور آہستہ آہستہ کیا کرو۔ تاکہ سامع یہ سمجھ سکے کہ کیا پڑھا جا رہا ہے ——— اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اپنے متعلق بتلاتا ہے کہ :

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ	(یہ قرآن) ایک کتاب مبارک ہے۔
لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ	جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے کہ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور
(سورہ ص)	سمجھ دار لوگ اس سے نصیحت پکڑیں

قرآن حکیم کتابِ مقدس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو کہ حیاتِ انسانی کی پُرپیچ راہوں پر راہنمائی و دستگیری کے فرائض انجام دیتا ہے ——— اور یہ بدیہی بات ہے کہ اس سے اسی وقت راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے جبکہ اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھا جائے۔

بحمداللہ ہر دور میں ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں کہ جنہوں نے اپنی پوری زندگی اس کتاب کو سمجھنے، اس میں تدبر کرنے اور پھر سمجھانے میں گذار دی اور ان کی زندگی کا نصب العین ہی یہ تھا کہ کتاب اللہ کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور اس کے احکامات بالقوۃ نافذ کئے جائیں ——— انہی خوش بخت اشخاص میں سے ایک امیرِ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی ہے کہ انہوں نے "دعوتِ رجوع الی القرآن" کو ایک تحریک کی شکل میں بپا کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے اور ۱۹۶۵ء سے تاحال ملک کے طول و عرض میں موصوف کے دروسِ قرآن کا سلسلہ جاری ہے اور وہ کتاب و سنّت کی اساسات پر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔

اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن حکیم کا ترجمہ اور مختصر تشریح ایک دفعہ لوگوں کے سامنے آجائے، پچھلے سال رمضان المبارک میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت برکاتہم نے تراویح میں اس بات کا اہتمام فرمایا کہ ہر چار رکعت میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ و مختصر تشریح بیان فرمائی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب اور مفید رہا۔ اس سے سامعین کے سامنے ایک دفعہ پورے قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کی دعوت آگئی۔ واضح رہے کہ اگست ۸۴ء کے میثاق میں اس دورۂ ترجمۂ قرآن کی تفصیلات اور شرکاء کے تاثرات شائع کئے جا چکے ہیں جس سے اس

پروگرام کی افادیت کا ایک اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

گذشتہ سال کی افادیت اور لوگوں کے ذوق و شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سال بھی قرآن اکیڈمی میں رمضان المبارک کے دوران نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔ یہ رمضان المبارک مئی اور جون کے شدید ترین گرم موسم میں تھا۔ اس کے باوجود قرآن حکیم سے محبت و شغف اور وابستگی رکھنے والے حضرات نے رمضان کے دوران دن میں روزہ کی مشقت برداشت کی اور پھر راتیں اس کیفیت میں گذاریں کہ یا تو تراویح میں قرآن مجید کی سماعت ہو رہی ہے اور یا پھر پورے توجہ و انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ قرآن کا ترجمہ اس کے علوم و معارف اور احکامات کو کانوں کے راستے ذہن و قلب میں اتارا جا رہا ہے۔ گویا پوری رات قرآن حکیم کے ساتھ بسر ہو رہی ہے۔

پروگرام کی تفصیل اس طرح سے تھی کہ نمازِ تراویح کی ہر چار رکعت سے قبل ان میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب بیان کرتے تھے اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوتی تھی ربط آیات کی جانب بھی اشارہ فرما دیتے تھے۔ اس طرح کل پانچ مرحلوں میں تراویح کا پروگرام مکمل ہوتا تھا۔ ہر چار رکعت اور اس سے قبل ترجمے کے بیان میں قریباً ۵۰ منٹ صرف ہوتے تھے۔ اس طرح مجموعی طور پر قریباً ساڑھے چار گھنٹے میں یہ پروگرام مکمل ہوتا تھا۔ عشاء کی نماز ساڑھے نو بجے کھڑی ہوتی تھی۔ اور نمازِ تراویح اور وتروں سے فارغ ہوتے ہوتے عام طور پر سوا دو بج جاتے تھے۔ اور چونکہ اس کے ساتھ سحری کا وقت شروع ہو جاتا تھا۔ اس طرح یہ پروگرام پوری رات پر محیط ہوتا تھا۔

اس پروگرام میں جہاں سامعین نے پورے رمضان المبارک کے دوران روزانہ شب بیداری کی مشقت برداشت کی وہاں سب سے بڑھ کر مشقت امیرِ تنظیم اسلامی کو برداشت کرنا پڑی۔ پہلے عشرہ کے دوران ڈاکٹر صاحب مدظلہم کی طبیعت کافی ناساز رہی۔ صورت یہ تھی کہ مسلسل حرارت رہتی تھی لیکن محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ دن بھر دفتری اور انتظامی امور میں مشغول رہتے اور پھر رات کے پروگرام میں بھی سب سے بھاری ذمہ داری آپ ہی کے سر تھی۔ چنانچہ ترجمہ و تشریح کے ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کا بیان لگ بھگ ساڑھے تین گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا۔ لیکن اس مردِ مومن نے اس تمام مشقت کو لوجہ اللہ برداشت کیا تاکہ لوگوں تک اس کا پیغام و احکامات

پہنچا کر کسی درجے میں تبلیغِ قرآن کی ذمہ داری ادا کی جا سکے۔ ہمیں اپنے رب کے حضور الحاح و زاری سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ امیرِ تنظیم کو درازیٔ عمر کے ساتھ صحت و تندرستی عطا فرمائیں تاکہ وہ دینِ اسلام کی مزید خدمات انجام دے سکیں۔ (آمین)

نمازِ تراویح میں قرآن حکیم سنانے کی ذمہ داری حافظ رفیق صاحب کے سپرد کی گئی تھی۔ جو کہ قرآن اکیڈمی کے رفقاء (۱۹۹۰ء) میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو حسن صوت سے نوازا ہے۔ اور موصوف قرآن حکیم کو اس طرح صاف اور واضح پڑھتے ہیں کہ ایک ایک لفظ صاف اور سمجھ میں آتا ہے ـــــ ۱۴ رمضان المبارک کو حافظ رفیق صاحب کے والد کا بہاولپور میں انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے انہیں تقریباً وسط رمضان میں بہاولپور جانا پڑا۔ قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ مرحوم کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔ اور درجاتِ عالیہ سے نوازیں (آمین)

۱۴ رمضان المبارک بروز منگل سے تراویح میں قرآن پڑھنے کی ذمہ داری محترم عاکف سعید صاحب (جو کہ امیرِ تنظیم کے صاحبزادے اور میثاق کے رکنِ ادارۂ تحریر ہیں) نے سنبھالی۔ اور آپ نے بھی "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا" کے حکم کے مدِّنظر رک رک کر اور صاف۔ واضح تلاوت فرمائی اور چونکہ شرکاءِ پروگرام پہلے سے ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ سُن چکے ہوتے تھے۔ اس لیے نماز میں شغف و دھیان لگا رہتا تھا۔ اور مقتدی حضرات جوں جوں قرآن سنتے جاتے اس کا مفہوم بھی ساتھ ساتھ ذہن و قلب میں اترتا جاتا تھا۔ اور اس سے جو کیف اور روحانی لذت حاصل ہوتی تھی غالباً شرکاء کے لئے تمام رات جاگ کر گزارنے کا سب سے بڑا محرک وہی تھا

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں یقیناً خیر ہی کا فیصلہ فرماتا ہے اور بلاشبہ اس کے فیصلوں اور اس کی مشیّت میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کی مشیّت ہی کا یہ مظہر تھا کہ ۱۵ رمضان المبارک کو، جبکہ حافظ عاکف سعید صاحب کو تراویح میں قرآن سناتے ہوئے ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ ان کے صاحبزادے "حسین عاکف" کا ناگہانی طور پر بجلی کا کرنٹ لگنے سے انتقال ہو گیا۔ (إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ) حسین عاکف کی عمر تک بھگ دو برس تھی۔ بھائی عاکف نے اس موقع پر انتہا صبر و استقامت سے کام لیا۔ قارئین سے گذارش ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ عاکف سعید صاحب کو صبرِ جمیل عطا فرمائیں اور اس کا نعم البدل عطا فرمائیں۔ (آمین) ـــــ چونکہ بچے کا انتقال افطار سے آدھ گھنٹہ قبل ہوا تھا

اور تدفین دورانِ شب ہی عمل میں لانی تھی۔ اس لیے ۱۵ رمضان المبارک کو نمازِ عشاء میں محترم ڈاکٹر صاحب نے شرکاء کو اپنے پوتے کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے نہایت صبر و ضبط کے ساتھ یہ اعلان فرمایا کہ آج چونکہ بچے کی تدفین کا مرحلہ طے کرنا ہے لہٰذا آج دورہ ترجمہ کا پروگرام نہیں ہو سکے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح فرمایا کہ کل سے یہ پروگرام حسبِ سابق جاری رہے گا۔ چنانچہ اس روز نمازِ تراویح کی بیس رکعت پڑھ کر نمازِ جنازہ گیارہ بجے رات ادا کی گئی اور پھر تدفین عمل میں آئی — ۱۶ رمضان المبارک یعنی دوسرے ہی دن سے حسبِ اعلان ترجمہ قرآن کا پروگرام شروع ہو گیا اور بھائی عاکف سعید ہی نے آخر تک تراویح میں قرآن سنانے کی ذمہ داری کو نبھایا۔

اس سال رمضان المبارک میں جو دورۂ ترجمۂ قرآن ہوا اس کی ریکارڈنگ کا خصوصی انتظام کیا گیا اور محمد احمد صاحب نے انتہائی جانفشانی اور اہتمام سے اس پورے ترجمۂ قرآن کو ۶۰ - C کے ۸۳ کیسٹس میں ریکارڈ کیا ہے اور اب یہ مکمل سیٹ ریکارڈنگ کے مراحل سے گزر کر آ چکے ہیں اور ادارہ نشر القرآن، ۳۶ کے - ماڈل ٹاؤن لاہور سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ترجمۂ قرآن دو طرح کے کیسٹس پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ جاپانی کیسٹوں پر مبنی سیٹ کی قیمت ۲۰۰۰/- روپے اور پاکستانی کیسٹوں والے سیٹ کی قیمت ۱۳۰۰/- روپے معین کی گئی ہے۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کے اس سیٹ کے ذریعے جہاں قرآن حکیم کا ایک سہل اور رواں ترجمہ سامع کے سامنے آتا ہے وہاں قرآن حکیم کی آیات اور سورتوں کے مابین جو ربط ہے وہ بھی پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ تعلیم و تعلّم قرآن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے بلاشبہ یہ ایک قیمتی اور مفید متاع ہے۔ اس سیٹ کے حصول کے خواہشمند حضرات پیشگی مطلع فرمائیں۔ تاکہ آرڈر کے مطابق سیٹ تیار کرائے جا سکیں۔

رفقاءِ تنظیم سے گذارش ہے کہ وہ اس دورۂ ترجمۂ قرآن کے کیسٹس کو زیادہ سے زیادہ عوام الناس میں متعارف کرائیں تاکہ پورے ملک میں "دعوت رجوع الی القرآن" کی تحریک آگے بڑھے۔ اور لوگ قرآن حکیم کی تعلیمات و احکامات سے متعارف ہو سکیں رفقاءِ کرام کی یہ کوشش ان شاء اللہ اسلامی انقلاب کے لئے ایک سنگِ میل ثابت ہو گی۔

پرائم

پرائم

Prime

Prime

Prime

پرائم ڈیریز لمیٹڈ لاہور

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 4 | JULY 1985 | No. 5

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

سلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ